دیدیا ہے، یا خود مصنف نے اپنی تحریر اس میں ملا کر شامل کر دی ہے، مولانا شروانی کے معاصرین میں ڈاکٹر اقبال کو ان سے عمر میں بڑا بتایا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، مولانا شروانی اور مولانا سلیمان اشرف کے تعلقات کے ضمن میں علامہ سید سلیمان ندوی کے وہ تاثرات نقل کیے گئے ہیں جو انھوں نے مولانا سلیمان اشرف کی وفات پر تحریر فرمائے تھے، اس میں دونوں کے تعلقات کا کوئی ادنی اشارہ بھی نہیں ہے، ص ۴۰۵ پر مولانا کی خوش طبعی کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ "تحریروں میں تو انھیں (مولانا کو) اس کے اظہار کا موقع نہ تھا" مگر اسکے بعد دو ڈھائی صفحوں تک مولانا کی جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، ان سے انکی خوش طبعی اور ظرافت ظاہر ہوتی ہے، املا و کتابت کی غلطیاں تو بیشمار ہیں، ص ۳۹۴ پر خورد کو تین تین جگہ خرد لکھا گیا ہے، کہیں کہیں سنین بھی غلط لکھے گئے ہیں، مثلاً ص ۱۶۱ پر ۴۳ء کے بجائے ۶۴ء ہے، ان خامیوں سے قطع نظر کتاب بجائے خود محنت اور خوش سلیقگی سے مرتب کی گئی ہے، نواب صاحب کی زندگی بڑی پاکیزہ اور دلکش تھی، وہ اپنے عہد کی ہر علمی و اجتماعی بزم کی رونق اور تمام علمی و تعلیمی تحریکوں کے روح رواں تھے، اور اس دور کے اکثر اعیان و اکابر سے ان کے تعلقات تھے، اس حیثیت سے یہ کتاب گویا اس عہد کی بڑی دلچسپ، سبق آموز اور قابل مطالعہ تاریخ ہے،

تصورات بیدل: از پنڈت کیلاش نرائن کول دہلوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ر، پتہ: ناشر محل، امین آباد، لکھنؤ۔

یہ آنجہانی پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل کا مجموعۂ کلام ہے جسکو ان کے فرزند پی، این کول صاحب نے نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے، اسکے شروع میں چند رباعیاں و قطعات اور آخر میں نظمیں ہیں، مصنف کو زیادہ مناسبت غزلوں سے تھی، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، بیدل صاحب شاعری کی قدیم، صالح روایتوں اور اسکے جدید انداز سے واقف تھے، ان کے دردمند دل میں انسانیت کا درد و غم، وطن کی الفت و محبت اور موجودہ گراوٹ اور بناوٹ کے خلاف نفرت کا جذبہ موجزن تھا، اسلیے انھوں نے غزلوں میں رمز و کنایہ کے پردہ میں غم زمانہ کی حکایت سنائی ہے، مصنف کی زبان کی سادگی، انداز بیان کی سلاست اور طبیعت کے سوز و گداز نے انکے تغزل میں بڑی کیفیت اور لطافت پیدا کر دی ہے، اور یہ مجموعہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۰ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمن	۳۲۲-۳۲۴
مقالات		
مولانا محمد علیؒ کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	۳۲۵-۳۵۲
کیا علامہ ابن حبان پر زندقہ کا الزام صحیح ہے؟	ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین	۳۵۳-۳۶۸
ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ کے بعض اہم ماخذ،	جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ،	۳۶۹-۳۷۸
کلکتہ کا ایک علمی سفر	سید صباح الدین عبدالرحمن	۳۷۹-۳۹۷
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۸-۴۰۰

شذرات

دارالمصنفین اس وقت مالی مشکلات سے دوچار ہو رہا ہے، اس کا سالانہ بجٹ تقریباً ایک لاکھ روپیہ کا ہوتا ہے، اس کے مختلف شعبوں میں چالیس آدمی کام کرتے ہیں، ان سب کی تنخواہیں عام معیار کے لحاظ سے بہت کم ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے خدمتگذار ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے، ان کی قناعت پسندی ضرور قابلِ قدر ہے مگر ادارہ کی طرف سے اُن کو قوتِ لایموت کا جو سامان ہوتا تھا، اس کا بھی اب فراہم کرنا مشکل ہو رہا ہے،

……………

دارالمصنفین کو یو، پی یا مرکزی حکومت کی طرف سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں حکومت کشمیر سے پانچ ہزار سالانہ کی امداد مقرر کرائی تھی، انھوں نے ازراہِ سرپرستی وعدہ فرمایا تھا کہ آیندہ یہ رقم اور بھی زیادہ بڑھوا دی جائے گی، مگر وہ اس رقم کے جاری ہونے کے بعد جلد ہی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ پانچہزار کی سالانہ امداد اب تک مل رہی ہے لیکن ہر سال یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں بند نہ ہو جائے، نظام ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے پانچسو روپے ماہانہ کی رقم گذشتہ دو سال سے مل رہی ہے، لیکن یہ مستقل نہیں ہے، اس ٹرسٹ کو مسلسل امداد دینے کا شاید قانونی حق بھی نہیں، ان قلیل رقموں سے تھوڑا سہارا ضرور مل جاتا ہے، ورنہ اور تمام اخراجات کا بار ادارہ کو خود اٹھانا

پڑتا ہے، جو مطبوعات کی فروخت سے اب تک پورے ہوتے رہے ہیں، لیکن اس کی فروخت اب بہت کم ہو گئی ہے، اُس کے بہت سے اسباب ہیں، تقسیم سے پہلے پاکستان میں اب جو علاقے ہیں، وہاں بکثرت وی، پی کے ذریعہ سے کتابیں جایا کرتی تھیں، تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں وی پی۔ اور منی آرڈر کا بھیجنا بند ہو گیا، تو ایک بڑی آمدنی جاتی رہی، پھر وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ سے کتابیں منگوانے لگے، اس طرح بھی ہماری کتابیں پہلے کی طرح تو نہیں، پھر بھی وہاں بہت کافی تعداد میں جایا کرتی تھیں جس سے تقریباً پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی، ۱۹۶۵ء سے جب دونوں ملکوں کا تجارتی لین دین بند ہو گیا، تو گذشتہ سات سال سے ادارہ کو تقریباً اتنی ہی رقم کا سالانہ خسارہ ہو رہا ہے، جو اب تک محض رحمتِ ایزدی سے پورا ہوتا رہا، لیکن اب اس ادارہ کی قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے،

……………

ہندوستان میں ہماری مطبوعات کی فروخت اتنی نہیں ہوتی، کہ اس سے ہمارے اخراجات پورے ہوں، ایک تو یہاں کے اردو پڑھنے والوں کی قوتِ خرید کسی زمانہ میں زیادہ نہیں رہی، وہ کتابوں کو شوق سے ضرور پڑھتے ہیں، لیکن خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتے، پھر جو اصحابِ ذوق خریدنا بھی چاہتے ہیں، تو اُن کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی، کہ اپنے اور اخراجات پورا کر کے کتابیں بھی خرید سکیں، جن کے پاس کافی دولت ہے وہ کتابوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے، ادارہ کی طرف سے اچھی خاصی تنخواہ پر ایک نمایندہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مختلف شہروں میں جا کر اس کی مطبوعات کی فروخت و اشاعت کی کوشش کرے، مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے، اس کی تنخواہ کی گرانباری سے مالی مشکلات کا اور اضافہ ہو گیا ہے،

……………

ہمارے اخراجات دو قسم کے ہیں، ایک تو یہاں کے خدمت گذاروں کو پابندی کے ساتھ ہر مہینہ تنخواہیں ادا کرنا، کیونکہ ان کو جو تھوڑی بہت تنخواہ مل جاتی ہے، وہ بھی نہ ملے تو محض خدمت و ایثار کا جذبہ اب زیادہ کارگر نہیں بنایا جا سکتا، دوسرے نئی مطبوعات میں اضافہ کرنا اور پرانی مطبوعات کو چھاپتے رہنا، الحمد للہ اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے ہر سال کچھ نہ کچھ کتابوں کا پرانا اڈیشن ختم ہوتا رہتا ہے اگر یہ نہ چھاپی جائیں تو تجارتی آمدنی پر اثر پڑ جاتا ہے، کوشش اب تک یہی رہی کہ پرانی کتابوں کے ساتھ ہر سال کم سے کم دو نئی کتابیں بھی ضرور شائع ہوتی رہیں، ہماری کتابوں کی اوسطاً ضخامت چار سو سے کم نہیں ہوتی بعض کی ضخامت تو نو نو سو صفحے کی بھی ہے نئی اور پرانی دونوں کتابوں کی طباعت میں کافی اخراجات ہوتے ہیں جنکو اب پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

.......۰۰.......

دار المصنفین اپنی امداد کے سلسلہ میں کسی سے کوئی چندہ یا عطیہ نہیں مانگتا ہے آج تک اس نے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، وہ صرف اس کا خواستگار ہے کہ اسکی کتابیں زیادہ سے خرید کر پڑھی جائیں اسکے علاوہ اسکی طرف سے دو قسم کی دائمی رکنیت بھی ہے ایک ایک ہزار کی اور ایک پانچسو کی جو صاحب ایکہزار کی رقم دیتے ہیں اُن کی خدمت میں گذشتہ مطبوعات میں سے پانچسو قیمت کی کتابیں فوراً بھیج دیجاتی ہیں پھر تا حیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف ہدیۃً بھیجا جاتا ہے جو صاحب پانچسو کی رقم دیتے ہیں اُن کے پاس ڈھائی سو کی کتابیں فوراً بھیج کر تا حیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف جاتا رہتا ہے، ہماری اپیل ہے کہ لوگ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کریا کافی تعداد میں اس کے رکن دوامی بن کر اسکی مالی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کریں، ورنہ خدانخواستہ یہ مالی پریشانیوں سے ختم ہو گیا تو جہاں اسکے وابستگان پر یہ الزام آئیگا کہ وہ اس شاندار علمی ادارہ کو برقرار نہ رکھ سکے، وہاں اُردو داں طبقے بھی مورد الزام قرار پائیں گے کہ وہ ایک مفید ادارہ کو قائم رکھنے میں مدد نہ پہنچا سکے، اس کو برقرار رکھنے میں اُن کی حمیت اور علم دوستی کا بھی امتحان ہے،

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

موجودہ دور میں دنیا کے مسلمانوں کی جو المناک سیاسی حیثیت ہو رہی ہے اس سے کون ایسا مسلمان ہے جس کا دل نہ دکھتا اور کڑھتا ہو گا، خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں میں جو سیاسی اور مذہبی بدحالی بلکہ کردار شکنی اور ضمیر فروشی پیدا ہوتی جا رہی ہے، اس کو سوچ کر عام مسلمان تحیر، اضطراب اور مایوسی کے دور سے گزر رہے ہیں، وہ ڈر کر اپنی پچھلی تاریخ کو دیکھتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ انھوں نے ہندوستان میں رہ کر اپنی حکومت کے زمانے میں اس کو سیاسی، اقتصادی اور تمدنی حیثیت سے کس طرح سنوارا، وہ دورِ غلامی میں بھی بیسویں صدی کے شروع کے زمانہ کو اپنے لیے بڑا تابناک پاتے ہیں، کیسے اچھے اچھے دماغ اس وقت موجود تھے، علامہ شبلی، حالی، نذیر احمد، آزاد، سر آغا خاں، سر امیر علی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، خواجہ کمال الدین، سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسین احمد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی۔ یہ دور اسلامی جذبہ، اسلامی غیرت اور اسلامی حمیت میں سرشار رہنے کا تھا، شبلی، حالی اور

نذیر احمد کی تحریروں میں اسلام کی رجز خوانی اور حدی خوانی تھی، سر آغا خاں اپنے تعیش اور ڈربی کے گھوڑ دوڑ کی دلچسپی کی وجہ سے بدنام تھے لیکن ان میں جیسی اسلامی غیرت رہی، وہ بھی قابل قدر سمجھی جاتی ہے، سر امیر علی جیسے انگریز نما ہندوستانی مسلمان نے اسلام کی اسپرٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ترکوں کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے، خواجہ کمال الدین نے تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ آئیڈیل پر افٹ لکھ کر شاید اپنی عاقبت بھی سنوار لی، مولانا حسین احمد مدنی نے سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ حدیث کی سند میں حرف آخر سمجھے جاتے، مولانا شبیر احمد عثمانی سیاسی رہنما بھی بنے لیکن کلام پاک کی تفسیر کے بہت بڑے نکتہ ور عالم بھی تصور کیے جاتے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے لیکن اسی کے ساتھ جو کثیر علوم اسلامیہ کے فرہاد بھی قرار دیے گئے، اقبال حکیم الامت اور شاعر مشرق بن کر اسلامی دنیا کے افق پر بھی چمکے، مولانا ظفر علی خاں کی نظموں میں اسلامی اخوت کی للکار اور پکار رہی، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ تو اسلام کی برتری کے مغرورانہ احساس کا صور پھونکا، اور بڑے اذعان و یقین کے ساتھ مسلمانوں کو یہ پیام دیا کہ اسلام ایک روحانی انقلاب تھا جو اس لیے ہوا کہ دنیا تغیر کے لیے بیقرار اور تبدیلی کیلیے تشنہ تھی، وہ سرچشمۂ ہدایت و فیضان الٰہی کا ایک سر جوش آسمانی تھا، وہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک ظہور الٰہی تھا جس نے نسل آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانے کو یکجا کیا، اور زمین کی امنیت اور سعادت واپس دلایا، مولانا نے اپنی مختلف تحریروں سے مسلمانوں کو یہ کہکر جھنجھوڑا کہ وہ اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتے ہیں، وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ وہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا شیطانی قوتوں کی انسانوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری

زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنالیں، وہ دنیا میں اس لیے آئے ہیں کہ حاکم ہوں نہ اس لیے کہ غلام ہوں، وہ خود ایسی قوت ہیں کہ دوسری قوتیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پاسکتی ہیں، وہ کسی کے آگے جھکنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے،

الہلال کے ساتھ مولانا محمد علی کا کامریڈ یاد آجاتا ہے، اور پھر ان کی پرشور اور ہنگامہ خیز زندگی نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے جس میں صرف توحید کے اذعان اور ایمان کے راسخ عقیدے ہی کے جلوے نظر آتے ہیں، کچھ روز پہلے اُن کی یادوں کی شمع میرے ذہن میں کچھ ایسی روشن ہوئی کہ ایک چھوٹا سا مضمون ان پر لکھنے بیٹھا لیکن قلم چلا تو چلتا گیا اور ایک لمبی تحریر کے بعد رکا، جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہے، یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے، بلکہ میرے ذاتی تاثرات و خیالات کے اوراق پریشاں ہیں، ان میں شاید کوئی نئی بات نظر آئے صرف پرانی باتیں یاد دلادی گئی ہیں، مولانا محمد علی کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ سچے اور پکے مسلمان ہونے کے ساتھ سچے اور پکے ہندوستانی بھی تھے ان پر خواہ کتنی ہی نکتہ چینیاں کی جائیں لیکن ان کی اسلامیت اور ہندوستانیت میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا، ان کی ذات اب بھی یہ پیام ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کی قوس و قزح سے ملک کی سیاست میں رنگین اور حسین بہار لائی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی یہ بہار نہیں لاسکتا ہے تو اس کی وجہ اس کی ناقص ذات ہوسکتی ہے، اسلامیت اور ہندوستانیت مورد الزام نہیں قرار پاسکتی ہے،

مولانا محمد علی کا اصلی وطن کہاں تھا، مراد آباد یا بجنور، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اتنا کافی ہے کہ وہ یو، پی کے تھے، ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں یتیمی کا داغ لگ گیا لیکن ان کی والدہ نے جو بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، ان کی تعلیم و تربیت

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ گھر پر اردو فارسی کی تعلیم دلا کر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کیا،
وہاں سے تعلیم کیلیے اپنے بڑے بھائی شوکت علی کی نگرانی میں علی گڑھ بھیجدیے گئے۔ وہ ایم اے او
کالج میں تعلیم پا رہے تھے، تب ہی انکے ساتھیوں کو ان کی عبقریت اور سیمابی کیفیت کا اندازہ
ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چاہتے تھے کہ وہ آئی سی ایس ہو کر
خاندان کا نام روشن کریں، لیکن خداوند تعالیٰ کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا، انھوں نے
لندن جا کر سول سروس کا امتحان تو دیا لیکن اس میں ناکام رہے، ہندوستان واپس
آکر پھر آکسفورڈ گئے، جہاں بی، اے کی ڈگری حاصل کی، ہندوستان واپس ہوئے، تو رامپور
کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے، جس کے بعد بڑودہ کے محکمۂ افیون کے ایک اعلیٰ افسر مقرر
ہوئے، یہاں رہ کر اپنی قابلیت دکھائی تو مہاراجہ بڑودہ نے ان کو ضلع نوساری کا کمشنر
مقرر کیا، اس کے بعد بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے،
اسی ملازمت کے دوران میں نواب صاحب جاورہ نے ان کو اپنے یہاں وزارت
پیش کی، اور بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سکریٹری کا عہدہ دینا چاہا لیکن
انھوں نے ان عہدوں سے منہ موڑا، اور طے کیا کہ وہ ایک اخبار نکال کر مسلمانوں
اور ہندوستانیوں کی خدمت کرینگے، چنانچہ ملازمت کی آلائشوں سے نجات حاصل
کر کے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ نکالنا شروع کیا، اس کے اجراء سے انکی انگریزی دانی
کا سکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی بیٹھا، ان کو اپنی ذہانت کی بدولت انگریزی
زبان کے طرز ادا اور طریقۂ بیان کے ہر پیچ و خم سے واقفیت تھی، ان کو انگلستان کے
جاہلوں، عالموں، گنواروں، شہریوں، امیروں، فقیروں، مزدوروں اور وزیروں
کی گفتگوؤں کے ادا کرنے پر یکساں قدرت اور مہارت حاصل تھی، انگلستان کے لاکھوں

کے نغمے، اناؤں کی لوریاں، آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں یاد تھیں، انگریزی زبان
کے ہر دور کے شاعروں اور ادیبوں کے جواہر پارے اُن کی زبان پر تھے، انجیل کی عبارتیں
ان کو ازبر تھیں، انگلستان کے لطیفے برجستہ بیان کر سکتے تھے، ان تمام چیزوں کا استعمال وہ
کامریڈ میں کرتے رہے، اسی لیے کامریڈ کی اشاعت کے زمانے میں کہا جاتا کہ کوئی ہندوستانی
انگریزی زبان پر اُن کی قدرت و مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آگے چل کر انگریزی
زبان کے مشہور مصنف ایچ، جی، ویلس نے کہا کہ ان کا قلم میکالے کا قلم ہے، اسی قلم سے
انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور سیاسی خیالات کو برانگیختہ کیا،
مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کا رنگ کچھ اور تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ کامریڈ
نے اپنے مضامین سے جس طرح مسلمانوں کو جگایا، وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں
الہلال ہی کی طرح بھلایا نہیں جا سکتا، اس انگریزی ہفتہ وار کے ساتھ مولانا نے اردو
کا ایک روزنامہ اخبار ہمدرد بھی فروری ۱۹۱۳ء میں نکالنا شروع کیا، خود کہا کرتے تھے کہ
ہمدرد تو مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے لیے ہے اور کامریڈ حکومت تک مسلمانوں کی
آواز پہنچانے کے لیے ہے،

کامریڈ کی صحافتی زندگی سے مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی بھی شروع ہوئی، ان کو
اپنے زمانہ میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ سے بڑا دکھ ہوا، پھر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو مولانا
آزاد ہی کی طرح وہ بھی بے چین ہو گئے اور کامریڈ کے صفحات میں انکی اس بےچینی کا اظہار ہوتا رہا،
اور جب ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ شروع ہوئی اور ترکوں کی شکست کی خبریں آنے لگیں،
تو وہ جذبات سے اتنا مغلوب ہو گئے کہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے، جیسا کہ وہ اپنی ناتمام خود نوشت
سوانح عمری میں لکھتے ہیں اس غیر شرعی فعل سے تو وہ باز رہے لیکن ترکوں کی حمایت میں جان

کی بازی لگادی"۔

ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ان کے یہاں خلافت قائم تھی، تو وہ گویا اسلامی ممالک کے ضمیر کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا اقتدار بلقانی ریاستوں کے علاوہ پورے مشرق وسطیٰ پر بھی تھا، اس لیے وہ ایک امپائر کے مالک تھے، اور اس امپائر کی وجہ سے دنیا میں اسلام کو بڑا وزن اور وقار حاصل تھا، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان سے بڑا لگاؤ تھا، مولانا محمد علی بھی ان کی محبت میں سرشار اور مخمور رہے، اسی لیے انھوں نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکوں کی مدد کے لیے ایک طبی وفد بھی بھیجا، یہ بظاہر ایک طبی وفد تھا لیکن اس کی تشکیل سے بڑا مذہبی اور سیاسی جوش ابھرا جس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہو رہا تھا تو لکھنؤ بھی آیا، علامہ شبلی بھی لکھنؤ اسٹیشن پر اس کو الوداع کہنے کے لیے پہنچے، اور جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری ٹرین کے ڈبہ کے دروازہ پر آکر کھڑے ہوئے تو مولانا شبلی نے ان کے بوٹ کا بوسہ لیا، اور اپنے آنسوؤں سے اس کے گرد و غبار کو دھویا، مولانا محمد علی اس وفد کے کارناموں کو اپنے اخبار کامریڈ میں برابر چھاپتے رہے، اور جب یہ وفد واپسی میں بمبئی پہنچا تو اس کے استقبال میں مسلمانوں نے ترکوں سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا علامہ شبلی اس وقت بمبئی ہی میں تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کے خیر مقدم کے لیے ان کے پاس پہنچے، تو ان کے پاؤں کا پھر بوسہ لینا چاہا، اور فرمایا یہ تمھارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں، خود علامہ نے ترکوں کی حمایت میں بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھیں، ان میں سے ان کی نظم شہر آشوب اسلام بہت مقبول ہوئی، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے ۔۔۔ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی ۔۔۔ دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے ۔۔۔ عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے ۔۔۔ تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوس کلیسا سے ۔۔۔ تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی حمایت میں دل کھول کر مالی قربانیاں کیں، انکی امداد و اعانت کے لیے بڑے بڑے شہر میں ہلال احمر کے نام سے ایجنسی قائم تھی، اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات کا خیال رکھتے ہوئے بلقانی ریاستوں کی سیاسی مدد کرنے سے باز رہے، لیکن یوروپین طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا،

مسلمانوں کے مشتعل جذبات ابھی تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی، ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان عجیب کشمکش میں پڑگئے، ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ حکومت برطانیہ کی حمایت کریں جس کے اندر رہ کر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یا ترکوں کے حامی بنیں جن سے ان کو بڑی محبت اور عقیدت تھی، کیونکہ ترکی ہی میں خلافت قائم تھی، اور ترک ہی پرستاران کعبہ اور اسلام کے تمام مقامات مقدسہ کے نگراں و نگہبان تھے، لیکن اس زمانہ کے برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے یقین دلایا کہ وہ اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دار السلطنت یا ایشیائے کوچک کے مشہور اور زرخیز سرزمین یا تھریس سے محروم کر دیں یا مقامات مقدسہ میں عراق، عرب اور جدہ پر قبضہ کریں۔ اس یقین دہانی پر ہندوستان کے مسلمان حکومت برطانیہ کے ساتھ ہوگئے، اور مسلمان سپاہی بھی فوج میں بھرتی ہوئے، لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو لندن ٹائمس

نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ میں دور کے تماشائی ہوں، اس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو. مضمون بہت ہی حقارت آمیز لب و لہجہ کے ساتھ لکھا گیا تھا، اس کو پڑھ کر مولانا محمد علی بے قابو ہو گئے، اور انھوں نے چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد کامریڈ کے لیے ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے لکھا، جو انگریزوں کے بالکل خلاف تھا، جب یہ مضمون شائع ہوا تو کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی، اس کے بعد مولانا محمد علی اور شوکت علی پہلے رامپور پھر مہرولی دہلی میں نظر بند کر دیے گئے، وہاں سے لینسڈون پھر چھندواڑہ منتقل کر دیے گئے، اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا تو دونوں بیتول جیل خانہ میں قید کر دیے گئے،

اس اثنا میں برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بہت سے نار وا سلوک کیے، رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا، اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اور قانون میں جو عام طور پر احتیاط ہوتی ہے اس میں اس کا نام تک نہ تھا، اس کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، گاندھی جی نے اس کو انسانی آزادی کے بالکل منافی قرار دیا، اور اسکے خلاف اپریل ۱۹۱۹ء میں اپنی ستیہ گرہ کی مہم چلائی، اس سلسلہ میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ہو جہاں بے دردی سے برطانوی حکومت نے گولیاں نہ چلائی ہوں، سب سے زیادہ دردناک حادثہ امرت سر کے جلیان والا باغ میں پیش آیا.

امرت سر میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی کوششوں سے ہندو مسلمان بہت ہی شیر و شکر ہو گئے تھے، وہاں رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، تو اس میں پچاس ہزار آدمی شریک ہوئے، پھر اس کے بعد رام نومی کا جلوس نکلا تو مسلمان اس میں کثرت سے شریک ہوئے، حکومت کو یہ فضا پسند نہ ہوئی، پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے ڈاکٹر

ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر بھیجدیا، اس سے امرت سر کے لوگوں کو بڑا دکھ ہوا، اور وہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر آکر احتجاج کرنے لگے، حکومت نے ان پر گولیاں چلا دیں، جس سے کچھ آدمی ہلاک ہوئے، یہ مجمع مشتعل ہو کر واپس ہوا، تو بینکوں اور دوسرے سرکاری دفتروں کو لوٹ لیا، اور اُن میں آگ لگا دی، کچھ انگریزوں کو بھی قتل کر ڈالا، اور بعض میموں پر حملے کیے، جس کے بعد جنرل ڈائر نے آکر شہر پر قبضہ کر لیا، ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ میں ایک جلسہ کا اعلان ہوا، جنرل ڈائر نے اسے ممنوع قرار دیا، لیکن اس روز ہندوؤں کا بیساکھی کا تہوار تھا اور میلہ بھی، اس لیے جلیانوالہ باغ کا چھوٹا سا میدان عورتوں، بچوں اور مردوں سے بھر گیا، جنرل ڈائر اس جلسہ کو منتشر کرنے کے لیے وہاں پہنچ گیا، اس نے فوراً اپنے فوجی دستہ کو گولی چلانے کا حکم دیدیا، اور اس وقت تک برابر گولی چلواتا رہا جب تک کہ ان سپاہیوں کے پاس گولی چلانے کیلیے کارتوس باقی رہے، کہا جاتا ہے کہ ۱۶۵۰ گولیاں چلائی گئیں، پانچ چھ سو آدمی ہلاک اور بے شمار اشخاص زخمی ہوئے، یہ جگہ چاروں طرف سے مکانوں سے گھری ہوئی تھی، اس لیے کوئی شخص جان بچا کر بھاگ نہ سکا،

امرت سر کی جس گلی میں میموں پر حملہ کیا گیا تھا، اس میں سے ہندوستانیوں کے گزرنے کی یہ شرط مقرر کر دی گئی کہ وہ وہاں سے گزریں تو زمین کے کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزریں، شہر میں مارشل لا جاری رہا جس کے ذریعہ بڑی سفاکیاں عمل میں آئیں، سر مائیکل اوڈائر اور ڈائر کے وحشیانہ مظالم کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بڑی نفرت پھیلی، اسی کے بعد ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا ایک نیا باب شروع ہوا، برطانوی حکومت کی پالیسی نرم پڑی تو تمام سیاسی قیدی غیر مشروط طور پر

رہا کر دیے گئے، علی برادران جیسے شیرانِ وطن اور فدائیانِ ملت بھی کم وبیش پانچ سال کے بعد نظربندی اور اسیری سے رہا ہوئے، گاندھی جی نے ان کی رہائی سے پورا فائدہ اٹھایا، برطانوی حکومت نے ترکوں کے ساتھ ناروا رویہ اختیار اور علی برادران کو قید کرکے مسلمانوں میں ایسا اشتعال پیدا کر دیا تھا کہ انگریزوں سے ان کی نفرت انتہائی درجہ تک پہنچ گئی تھی، جلیانوالہ باغ کے حادثہ سے عام ہندوستانیوں کو بھی حکومت کے خلاف بڑا غصہ تھا، اس نفرت اور غصہ سے آزادی کی جنگ کے سپاہیوں نے پورا فائدہ اٹھایا، گاندھی جی نے ہندو مسلمان دونوں کے جذبات سے واقف ہو کر ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اس سال امرتسر میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کے ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی رکھے گئے، علی برادران کو بیتول جیل سے رہائی کے بعد امرتسر ہی سیدھے آنے کی دعوت دی گئی، اور وہاں جس شاندار طریقہ پر ان کا استقبال کیا گیا، اس وقت تک کسی اور رہنما کا نہیں ہوا، پنڈت مدن موہن مالوی جی نے علی برادران کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا، اس کے بعد سے کانگریس کی سرگرمیوں میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا، جیسا کہ جواہر لال نہرو بھی لکھتے ہیں

"علی برادران اسی زمانہ میں نظربندی سے رہا ہوئے، اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لیے امرتسر پہنچ گئے، اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی"، (ص ۸۴ جلد اول)

اسی زمانہ میں لندن میں صلح کانفرنس ہونے والی تھی جس میں ترکی اور جزیرۃ العرب کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے جو فضا قائم ہو گئی تھی، اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ جرمنوں کے ساتھ ترکوں کو بھی شکست ہو جائیگی تو اس شکست کی وجہ سے ترکی کے حصے بخرے کرکے اس کو بالکل کمزور کر دیا جائے گا، اور اس کے امپائر میں سے جزیرۃ العرب

اور دوسرے اسلامی ممالک پر انگریزوں اور یوروپی قوتوں کا تسلط ہو جائے گا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اتحادیوں اور انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے، اس لیے مولانا محمد علی نے ہندو مسلمان لیڈروں کا ایک مشترکہ وفد ترتیب دیا جو اُس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملا، اور وائسرائے کو ہندوستان کی مسلم رعایا کے جذبات سے مطلع کیا، اس وفد کے ارکان میں مسلمان لیڈروں کے علاوہ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو بھی تھے، اس کے بعد یہ طے ہوا کہ جنگ عظیم کی صلح کانفرنس سے پہلے ایک وفد یورپ خصوصاً انگلستان جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو وہاں کی حکومت اور لوگوں کے سامنے پیش کرے، تاکہ وہ خلافت ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں، اس وفد کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابو القاسم صاحب اور سکریٹری جناب حسن محمد حیات صاحب منتخب ہوئے، جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہوا تو لوکمانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالویہ، گاندھی جی کی بھی نیک خواہشات اس کے ساتھ تھیں، اور تمام ہندو رہنما بھی اس کی کامیابی کے خواہاں تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ یہ وفد ہندوستان سے نہ صرف سات کروڑ مسلمانوں کی زبان بن کر گیا بلکہ جیسا کہ لوکمانیہ تلک آنجہانی نے وفد خلافت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا" وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر فرنگستان گیا تھا، اور حقیقت میں وہ یورپ کی سرزمین میں متحیر، خاموش، ساکن لیکن مضطرب انقلاب دنیائے اسلام کے جذبات و احساسات کا ترجمان تھا، اس طرح یہ وفد خلافت دنیائے تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی تبلیغی صدا، توحید

کی جانب سے تثلیث کو نذائے رجز بلکہ جیسا کہ پوپ آنجہانی نے وفد خلافت کے جواب میں کہا کہ وہ مذہب کی طرف سے الحاد کو اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا۔

یہ وفد ۱۹۲۰ء میں انگلستان پہنچا۔ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے وفد کے سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیے وہ ان کے مکاتیب کے مجموعے برید فرنگ سے معلوم ہوں گے، پھر برادر محترم جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی لکھی ہوئی حیات سلیمان میں بھی تفصیلات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جہاں تک تقریروں کا تعلق تھا، اس کا بار زیادہ تر مولانا محمد علی پر پڑا۔ افسوس یہ ہے کہ یہ تقریریں اردو کی کسی کتاب میں قلمبند نہیں ہوئیں، ۱۹۳۹ء میں کلکتہ گیا ہوا تھا، تو وہاں فٹ پاتھ پر کتابوں کے ایک ڈھیر میں All about the Khilafat delegation مل گئی، اس کے مطالعہ سے وفد کی ساری سرگرمیاں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

انگلستان پہنچکر اس وفد نے پہلے اس زمانہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو سے ملنا چاہا، مسٹر مانٹیگو تو خود نہ ملے، وہ علیل تھے، لیکن ان کی طرف سے مسٹر فشر، سر ولیم ڈیوک مسٹر جے، ای شک برگ اور مسٹر ایس، کے براؤن ملے، اس ملاقات میں مولانا محمد علی اور سید حسن نے بڑی مدلل تقریریں کیں، ان کا مطالبہ تھا کہ خلیفہ کے ماتحت اسلام کے تمام مقدس مقامات برقرار رکھے جائیں، جزیرۃ العرب پر بھی خلیفہ کا تسلط ہو، اور وہاں اتحادیوں کا کوئی حلیف اور پٹھو حکمراں نہ بٹھایا جائے، خلیفہ کو مضبوط اور طاقتور برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سلطنت سیاسی، بحری، اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہو، اس لیے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے نہ کیے جائیں، مولانا

محمد علی نے ان مسائل کو اپنی ایک پرزور تقریر میں پیش کیے، جس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اس تقریر کا اصلی لطف تو انگریزی ہی میں پڑھنے سے مل سکتا ہے کہ مولانا اس زبان پر غیر معمولی قدرت رکھنے کی وجہ سے اپنی تقریر میں کیا کیا رنگ ڈھنگ پیدا کر سکتے تھے، جملوں کے اندر جملے لاکر اپنے مطالب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے تھے، پھر اس میں ایسی روانی ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ ایک بہتا ہوا چشمہ ہے جو بہتا چلا جاتا ہے، تقریر کے اردو ترجمے میں وہ لطف نہیں مل سکے گا، لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا تقریر کرتے وقت کس طرح ابلتے، امنڈتے، پھٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے، جو کچھ کہتے نڈر ہو کر کہتے، اور اپنے ایمانی جوش، مذہبی غیرت اور ملی حمیت کا اظہار کرتے وقت بالکل نہ جھجکتے بلکہ اس کے اظہار ہی کو اپنی دنیاوی اور اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے، ان کی تقریروں سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ پہلے مسلمانوں کی قیادت کا کیا رنگ تھا، اور موجودہ دور میں کیا ہو کر رہ گیا ہے، مولانا نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ غالباً اس بات سے واقف ہیں کہ امرتسر میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس اس سال کے شروع میں ہوا جس میں دوسری بار یہ تجویز منظور ہوئی کہ پہلے ایک وفد یورپ اور امریکہ جائے تاکہ مسلمانوں کے نقطہ ہائے نظر بادشاہ سلامت کی حکومت، اتحادیوں اور صلح کانفرنس کے سامنے پیش کیے جائیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی احساسات اور جذبات سے آگاہ کر کے انکی پوزیشن کی وضاحت کیجائے، اور یہ بھی ظاہر کیا جائے کہ ہندوستان کی کثیر رائے عامہ ہندوستانی مسلمانوں کی تائید میں ہے،

"ہم لوگوں کو صحیح طور پر اس کا علم نہیں تھا کہ صلح کانفرنس کب شروع ہوگی، اور ترکوں سے کیا معاہدے ہوں گے، وائسرائے نے تو ہمارے سپاسنامہ کے جواب میں اپنے اس خطرہ کا اظہار کیا تھا کہ ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں اتنی تاخیر سے پہنچیں گے کہ مشکل سے ہماری شنوائی ہوگی، اسی لیے جب ہم ۲۲ فروری کو وینس پہنچے تو وہاں سے ہم نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور وزیر اعظم کو تار بھیجے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو کہنے سننے کا موقع دیا جائے، اب ہم یہاں ہیں، ہم اس کے شکر گذار ہیں کہ مسٹر مانٹیگو کی طرف سے ہمارا استقبال ہو رہا ہے اگرچہ مسٹر مانٹیگو کی علالت کی خبر پا کر ہم لوگوں کو افسوس ہوا،

اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے پہلے ہم یہ ظاہر کر دیں کہ جب ہم یہاں پہنچے، بلکہ یورپ کے سفر کے دوران ہی میں ہم نے محسوس کیا کہ آرمینیوں، یونانیوں اور ترکوں کے دوسرے مخالفوں کی طرف سے یہ پروپگنڈا ہو رہا ہے کہ ترکوں کی طرف سے بہت ہی ہولناک اور اشتعال انگیز جرائم سرزد ہوئے، ہم صاف طور پر یہ کہہ دیں کہ ہم اس طرح کے پروپگنڈے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ اس کے لیے نہ ہمارے پاس سرمایہ ہے نہ وہ اخلاق ہے اور نہ ایسے پروپگنڈے کے ذرائع ہیں، اس کے علاوہ اس وقت ترکوں کے بارے میں براہ راست معلومات کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس لیے ہم ان شدید الزامات کی تصدیق بھی نہیں کر سکتے، جو ان پر عائد کیے جا رہے ہیں، لیکن فروری ۱۵، ۱۶ کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا جو آخری اجلاس ہوا تھا، اس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد ایشیائے کوچک اور خلافت کے اندر جو علاقے ہیں وہاں جائے اور جب یہ وہاں پہنچ جائے تو وہاں کے قتل عام کی جو خبریں ہیں، ان کے سچ اور جھوٹ ہونے کی تصدیق کرے،

"ہمارے لیے یہ ایک مذہبی سوال ہے، ہم تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ واضح کر دیں کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بڑا اہم مذہبی معاملہ ہے، کہیں کہیں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی حکومت اور اتحادیوں پر اپنا فیصلہ نافذ کرائیں، جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں فیصلہ نافذ کرانے یا دھمکی دینے کا کوئی شائبہ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ترکی کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا، اس کا تعلق امپیریل پالیسی سے ہے یا صرف برطانیہ سے ہے، اگر اس کا تعلق صرف برطانیہ سے ہے تو پھر ہم کو کچھ کہنے کا حق نہیں رہتا، لیکن اس کے برخلاف اگر پورے برطانوی امپائر سے ہے اور بظاہر ہے، تو پھر اگر ہندوستانی مسلمان اپنا فیصلہ نافذ کرانے کا حق نہیں رکھتے، تو یہ حق برطانیہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا، یہ پورے امپائر کا ایک مشترکہ معاملہ ہونا چاہیے، ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اب صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ بادشاہ سلامت کی رعایا کی حیثیت سے ہم اپنے فرائض میں کوتاہی کریں گے اگر ہم یہ ظاہر نہ کریں کہ اب معاملہ کی صورت کیا ہے، یہ محض مسلمانوں کے جذبات کا سوال نہیں جو کسی کی خواہش کے مطابق بدل کر رکھ دیا جائے، یہ ایک مذہبی سوال ہے جس کا تعلق مذہبی عقیدہ سے ہے، خلافت کا سوال ہمارے عقیدہ کا نہ صرف ایک حصہ ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سراسر ہمارا مذہبی عقیدہ ہے، خلافت ان دنیاوی اور روحانی سرگرمیوں کو متحد کرتی ہے، جو اسلام کی تعلیم ہے، ہمارے رسول کی وفات کے بعد سے خلافت قائم ہے، اور اس کو ہر زمانہ میں قائم رہنا چاہیے، اسلام میں صرف روحانی پیشوائی کی قسم کی کوئی چیز نہیں، اسلام ایتھکس کا حرف آخر ہے، یہ ہمارے تمام کاموں کی رہنمائی کرتا ہے، مسلمانوں کی زندگی کا ہر کام ایک مذہبی کام

ہم بادشاہ سلامت کے ساتھ جو خدمات انجام دیتے ہیں، ان میں بھی مذہبی احساسات ہوتے ہیں
ہم اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں، وہ بھی مذہبی فرائض میں سے ہے،
اس لیے دنیاوی اور روحانی قیادت کی تفریق کرنا درست نہیں، خلیفہ پوپ سے زیادہ
حیثیت رکھتا ہے، اس سلسلہ میں جو غلط فہمی ہے، اس کو دور کر کے ہم خلافت سے متعلق اپنے
نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں،

"ایک ایسا ادارہ جو دنیاوی اور مذہبی دونوں ہو، اس کو برقرار رکھنا اسلام
کے لیے لازمی ہے، خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ اسکو دنیاوی اقتدار بھی حاصل ہو تاکہ وہ ہمارے
مذہب کی مدافعت کر سکے. یہ اقتدار وقتاً فوقتاً اس کے دشمنوں کی قوت کے ساتھ گھٹتا
بڑھتا رہتا ہے، لیکن یہ اقتدار اتنا کم نہ ہو کہ یہ بے اثر ہو جائے، ہمارا خیال ہے کہ بلقان
کی جنگ کے بعد خلیفہ کے اقتدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو وقار کے ساتھ
نہ برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ وہ موثر طریقہ پر اپنے دین کا حامی بن سکتا ہے، اسی لیے ہم اس کو
پہلے جیسی پوزیشن پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے بغیر وہ امیر المومنین نہیں ہو سکتا، اور نہ ہمارے
دین کو خطرے کے وقت بچا سکتا ہے'

"ہم سیاسی اور علاقائی تبدیلیوں کے مخالف نہیں ہیں، ہم کو اس پر اعتراض نہ ہوگا
اگر صلح کانفرنس کی رو سے ترکش امپائر کے غیر ترکی فرقوں کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان یا ہنود
خود مختاری دیدی جائے، یہ صدر ولسن کے چودھویں نکات کی بارہویں دفعہ کے مطابق ہوگا،
لیکن ایسی خود مختاری دیتے وقت عثمانی سلطنت کے وقار اور اقتدار اعلیٰ کو ضرور قائم
رکھا جائے،

"خلافت کو دنیاوی اقتدار کے ساتھ برقرار رکھنے کے علاوہ جزیرۃ العرب کا بھی سوال ہے

یورپ کے جغرافیہ دانوں کے لیے عرب محض ایک جزیرہ نما ہے، جو چاروں طرف سے زمین
سے گھرا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک جزیرہ ہے جس کی چوتھی سرحد کی طرف دجلا اور
فرات ہے، اس میں حجاز، یمن، نجد اور عرب کے دوسرے صوبے ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ
اس میں شام، فلسطین اور اس کے ملحق علاقے بھی داخل ہیں، اور یہ ہمارے رسول کا حکم صریح
ہے کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کا تسلط نہ ہو، یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ امریکہ، فرانس اور
برطانیہ کے عیسائیوں کو ان علاقوں کا اقتدار سپرد کر دیا جائے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے
ہم ہندوستان کی حکومت، پھر برطانیہ کی حکومت پر یہ واضح کر دیں کہ کوئی مسلمان اس کے
لیے رضامند نہیں ہوگا کسی مسلمان کا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکے گا،

مولانا محمد علی کی تقریر کے درمیان مسٹر فشر بول اٹھے کہ اگر مسلمانوں کا ضمیر فلسطین اور
شام پر عیسائیوں کا تسلط نہیں گوارا کر سکتا ہے، تو پھر مسلمانوں کا ضمیر ہندوستان میں
برطانوی حکومت کو کیسے گوارا کیے ہوئے ہے، اس کا جواب مولانا محمد علی کے ساتھی سید حسین
نے دیا کہ دونوں جگہوں میں فرق ہے، عرب میں مقامات مقدسہ ہیں، اسی لیے ان پر غیر مسلموں
کا قبضہ گوارا نہیں کیا جا سکتا،

اس کے بعد مولانا محمد علی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھکو افسوس ہوگا اگر
میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے قسطنطنیہ کی اہمیت کم ہو، کیونکہ یہ پانچ صدیوں سے خلافت
کا مرکز رہا ہے، اس کی اہمیت کو کم کرنا مسلمانوں کے جذبات کو اس لحاظ سے مجروح کرنا
ہے کہ وہ دار الاسلام کے کسی حصہ کو ہاتھ سے جانے دے سکتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا
کہ اگر قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا جائے تو اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو جزیرۃ العرب
پر غیر مسلموں کے تسلط سے ہوگا، یہ علاقہ غیر آباد سہی لیکن قرآنی آیتوں کی رو سے پیغمبروں

کی سرزمین ہے۔ اسی لیے اس پر اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار ہونا چاہیے۔ ہم اپنے کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا روحانی وارث سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اس علاقہ کو مقدس سمجھکر اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، ہم اس کے تقدس کو برقرار رکھنا لازمی تصور کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ علاقہ پرامن ہو، مومنوں کا مرکز ہو۔ اور یہاں مذہبی حکومت آسانی سے قائم ہوتی رہے، اس کے تقدس اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہے، وہ دن ہمارے لیے بہت ہی غمناک ہوگا، جب اس کا کوئی حصہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے خدائی احکام کی پابندی ہونے نہیں دی۔ اس لیے مسلمان کسی حال میں اس کو پسند نہ کریں گے کہ جزیرۃ العرب پر کسی غیر مسلم کا تسلط ہو۔

"مقامات مقدسہ کے بہت سے مذہبی احکام ہیں، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس ہمیشہ خلیفہ کے زیر اقتدار ہوں، کسی اور کا تسلط مسلمانوں کا ضمیر گوارا نہیں کر سکتا، مسلمانوں کا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ نجف، کربلا، کاظمین سامرا اور بغداد کا بھی نگران خلیفہ ہی ہو، ان پر غیر مسلموں کا اقتدار تو کسی حال میں بھی جائز نہیں، اس لیے مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور تمام مقدس مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہییں، جیسا کہ جنگ سے پہلے تھے، کیونکہ یہ سب جزیرۃ العرب میں واقع ہوئے ہیں جسکے ہر حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار ہونا ضروری ہے، اگر یہ خلیفہ کی نگرانی میں ہو جائیں، تو نہ صرف ایک مذہبی ضرورت پوری ہو جائے گی، کیونکہ اس طرح خلافت کو وہ دنیاوی قوت بھی حاصل ہو جائے گی جو ہمارے دین کی مدافعت کے لیے ضروری ہے بلکہ اسی کے ساتھ وزیر اعظم کا وہ وعدہ بھی پورا ہو جائے گا جو انھوں نے جنوری ۱۹۱۸ء کو کیا تھا، اور صدر ولسن کے چودہ[۱۴] نکات کی بارہویں دفعہ کی آبرومندانہ تکمیل بھی ہو جائیگی

جس کی بنیاد پر ترکی سے صلح کی گئی تھی، پھر مسلمان بھی خوش ہوں گے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا احترام باقی رکھ کر خلافت کی پہلی جیسی پوزیشن قائم رکھی گئی، ہمارا یہ وفد پھر مطمئن ہو جائے گا، کہ خلافت دنیاوی اقتدار اور کافی علاقے کے ساتھ باقی رکھی گئی، اگر ضرورت سمجھی جائے تو خلیفہ سے اچھی حکومت، زندگی کے تحفظ، مذہب میں رواداری اور علاقوں میں خود مختاری کی ضمانت بھی لی جائے، بشرطیکہ یہ خلیفہ کے وقار اور آزادانہ اقتدار اعلیٰ کے عین مطابق ہو۔

"یہاں پر میں یہ عرض کروں گا کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ اتحادیوں اور انکی حکومتوں کی رعایا کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سے وفاداری کا ثبوت دیں، لیکن ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خلافت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیں' ہم یہ نہیں چاہتے اور نہ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم جس سیاسی پوزیشن میں ہیں اس سے دور ہو جائیں، لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم حکومتوں کی غلط روش کی وجہ سے ایسے پریشان کن حالات میں ڈال دیے جائیں کہ خلیفہ کی حکومت کی طرف سے ہم پر جو فرائض ہیں ان کو انجام نہ دے سکیں، اگر ہم سے ایسے مطالبے کیے جائیں گے جو ہماری نجات کے منافی ہونگے تو پھر ہم اپنی پوزیشن پر از سر نو غور کریں گے۔

"جہاں تک اس ملک میں ترکوں کے خلاف پروپگنڈا کا سوال ہے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترکوں پر ان کے جرائم عائد کرتے وقت بہت سے ایسے مذہبی اور نسلی تعصبات بروئے کار آجاتے ہیں جو صدیوں سے ان کے خلاف ہیں، اس پروپگنڈا میں اس حریصانہ خواہش کو بھی دخل ہے جس کی بنا پر ترکوں کے ہمسائے عثمانی علاقوں کو زیادہ سے زیادہ ہضم کرنا چاہتے ہیں، ہم کم سے کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترکوں کے جرائم کو پیش کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے"

عیسائی دنیا کے بعض حصوں میں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے اس لیے نکال دینا چاہیے کہ وہ نہ صرف ترک ہیں بلکہ مسلمان ہیں، اسلام ان کے لیے ایک ناگوار چیز ہے، ہم کو ان گہرے تعصبات کو دور کرنا چاہیے، اور اسلام کے ساتھ جو مجرمانہ رویہ ہے، اس کو بھی بدلنے... کی ضرورت ہے، ہم مسلمان کی حیثیت سے اسکے بھی خواہاں ہیں کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کسی قسم کے شکوک نہ ہونے چاہئیں یہانتک ترکوں کے کردار کا یقین ہے، وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو پیش کیجاتی ہے، ہم یہاں پر گمرجا گھروں کے ان فتنہ انگیز اور تعصب آمیز پروپگنڈہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو ترکوں کے خلاف عرصہ سے جاری ہے، ہم یہاں آکر کوئی تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں، لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ترکوں کو غیر جانبدارانہ طور سے مطالعہ کرنے کی خاطر ان سازشوں کی تفتیش کرنے کی ضرورت ہے جو ترکوں کے دشمن ان کے خلاف دو صدیوں سے ان کی عیسائی رعایا میں اس لیے کر رہے ہیں کہ یورپ اور ایشیا میں عثمانی امپائر کے حصوں کو کاٹنے میں کامیابی حاصل ہو، یہ بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترکی میں رہنے والی عیسائی آبادی کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ہمسائگی کا ہے یا اشتعال انگیز ہے، اور اگر ترک قابل الزام تھے تو ان کو کافی سبق مل چکا، اور جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کیا گیا اور ترکوں سے ان کی توقع کے مطابق سمجھوتہ کیا گیا تو پھر وہ ترکوں پر اثر انداز ہوں گے کہ وہ حکومت برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے اچھے تعلقات رکھیں، ہندوستانی مسلمان ترکوں پر یہ دباؤ بھی ڈالیں گے کہ جن ہولناک جرائم کے الزامات ان پر رکھے جاتے ہیں، وہ نہ صرف ان سے سرزد ہوں، بلکہ دوسروں کے دلوں میں ان کے شکوک بھی پیدا نہ ہوں، مسلمانوں کی حیثیت سے

ہمارا یہ فرض ہے کہ اسلام کی نیک نامی پر غیر انسانی حرکتوں کا داغ نہ لگنے پائے، برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسلام کے اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کریں گے، ہندوستانی مسلمانوں کے ان اثرات سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، ہمارے مشن دو قسم کے ہیں، ہم بادشاہ سلامت کی حکومت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں، اور ہم پھر اپنے خلیفہ کو بھی معاملات سے آگاہ کریں کیونکہ وہ ہمارے امیر المومنین ہیں، ہم ان دونوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں، اگر خلافت کے معاملہ میں ہماری خواہش کے مطابق سمجھوتہ ہوا تو ہمارے اثرات اچھے قائم ہوں گے جو برطانوی امپائر اور انسانیت کے مفاد کی خاطر استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن اگر ایسا سمجھوتہ ہوا جو ہمارے جذبات اور مذہبی احساسات کے خلاف ہوا تو ہم کوئی ایسے الفاظ تو استعمال نہیں کریں گے جو دھمکی پر محمول کیے جائیں لیکن ہم صاف طور پر کہدیں کہ ہم اپنے مذہبی فرائض کو پہلے اہمیت دیں گے۔

"بادشاہ سلامت کی حکومت ہندوستان سے دور واقع ہوئی ہے، اس کا مذہبی اور سیاسی ماحول بھی مختلف ہے، اس لیے ہندوستان میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اسکا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل ہے، میں حکومت ہند اور اس کے حکام کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا، انھوں نے ہمارے وفد کا خیر مقدم بڑے اخلاق سے کیا، اور انھوں نے ہم کو ہندوستان سے یہانتک پہنچنے میں سہولتیں فراہم کیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ سرکاری حکام ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہمارے دلوں کے اندر کیا ہو رہا ہے، میری زندگی کے اوراق اس طرف کم و بیش سادہ اس لیے رہے ہیں کہ میں نے قید اور نظر بندی کی زندگی گزاری ہے، لیکن جناب عالی! میں آپ کو یقین

دلاتا ہوں کہ جب ہم جیل سے باہر آئے اور اپنی آنکھوں سے حالات دیکھے تو ہم پر شاق گزرا کہ رہائی کے بعد اب حالات کیا ہو گئے ہیں، ہندوستان میں اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں کہ جس نے اس کو پانچ سال پہلے دیکھا تھا وہ اس کو مختلف صورت میں پائیگا، یہاں ایسے تغیرات ہو گئے ہیں کہ جو معاملات برسوں میں طے ہوتے تھے اب مہینوں میں طے پائیں گے، ہندوستان کے سرکاری حکام یہاں کے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ترکوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال نہیں رکھا گیا تو پھر معاملہ بہت ہی خطرناک ہو جائیگا، میں انگریز نہیں ہوں اور نہ انگریزوں کی طرح انگریزی جاننے کا دعویٰ کرتا ہوں، اس لیے مجھکو ڈر ہے کہ جو میں الفاظ استعمال کروں، ان سے ایسے مطالب نکالے جائیں جو میرے ذہن میں نہ ہوں، میرے لیے اپنے خیالات کی تشریح کرنا تو مشکل ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب ہم لوگ یہاں آئے تو دار العوام میں قسطنطنیہ پر مباحثہ سننے کے لیے گئے، کرنل ویجوڈ نے اپنی بحث میں کہا کہ تم انگریزوں کو قائل کر کے ان سے بہت کچھ لے سکتے ہو لیکن ان کو دھمکی نہ دو، جناب عالی! یہ بات ہر خوددار قوم کے لیے ضروری ہے، اور جب انگریزوں کے لیے ضروری ہے تو جناب عالی! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے بتائیں کہ سخت سے سخت انتباہ کس طرح کیا جائے کہ وہ دھمکی پر محمول نہ ہو:"

مولانا محمد علی کے بعد سید حسین نے تقریر کی جس میں انھوں نے اپنے رنگ میں وہی ساری باتیں کہیں جو مولانا محمد علی کہہ چکے تھے، انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کے ہندو بھی خلافت کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، پھر مولانا محمد علی اور سید حسین دونوں نے اس منشور کی تفصیل بتائی جو گاندھی جی کی نگرانی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس میں منظور ہوا تھا، دونوں نے یہ بتایا کہ جس وقت یہ منشور

پیش ہوا تو گاندھی جی نے علماء سے جرح کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کا یہ مذہبی مسئلہ ہے، لیکن ہندوؤں کو اپنے ہموطن مسلمانوں کے اس مسئلہ میں اس لیے ساتھ دینا چاہیے کہ اگر ہندوؤں پر اسی قسم کا مشکل وقت آیا تو مسلمان بھی ان کا ساتھ اسی طرح دیں گے، اس کے بعد برطانوی حکومت کے نمائندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جو اس لیے یہاں پر پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ انگریز اپنی فتنہ انگیزیوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر کیسے خوبصورت انداز سے پردے ڈال کر اپنی مطلب برآری کر سکتے ہیں، اور پھر کیسے میٹھے اور ملائم الفاظ میں سخت سے سخت باتیں بھی کہنے کے عادی رہے ہیں، وہ الفاظ اور جملوں کے جال میں اپنے مخاطبین کو پھنسا کر رکھ دینے میں کیسے ماہر ہوتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مسلمانوں کے تمام مقامات مقدسہ پر جزیرۃ العرب کا کیسے تسلط ہو سکتا ہے، کیونکہ میرے تصور میں یہ بات ہے کہ مسوپوٹومیا کے مقامات مقدسہ تو صرف شیعوں کے لیے مقدس ہیں اور شیعے خلیفہ کو تسلیم نہیں کرتے،

مولانا محمد علی نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان مقامات مقدسہ کا احترام مسلمانوں کے تمام فرقے کرتے ہیں، سنی مسلمان بھی ان کی زیارت کو جایا کرتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ لیکن یہاں زائرین میں زیادہ تر شیعے ہی ہوتے ہیں، سنی مسلمان وہاں جانا شیعوں کی طرح ضروری نہیں سمجھتے،

اس کے بعد رائٹ آنریبل مسٹر فشر بولنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا آپ لوگ بہت دور دراز کی مسافت طے کر کے اپنے معاملات کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، آپ نے اپنی انگریزی دانی پر معذرت کی، لیکن اس

معذرت کی ضرورت نہ تھی، آپ نے اپنے معاملے کو پوری وضاحت کے ساتھ اچھی طرح پیش بلکہ میں یہ کہوں گا کہ بڑے اعتدال سے پیش کیا ہے، برطانوی حکومت کو اس کا احساس ہے کہ گذشتہ جنگ میں دس لاکھ ہندوستانی سپاہیوں نے بڑی قیمتی مدد پہنچائی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان سپاہیوں میں بہت سے مسلمان تھے، برطانوی حکومت کو ان مسلمان فوجیوں کے جذبات کا بھی احساس ہے، جو ان کی خاطر جنگ میں لڑے، ہندوستان کی وفادار مسلمان رعایا کے احساسات کا بھی خیال ہے، اور آپ یقین جانیں کہ ہم لوگ آپ کے ہم مذہبوں کے مذہبی جذبات و احساسات کو پورے طور پر ملحوظ رکھیں گے، اور جو بھی بین الاقوامی سمجھوتہ ہوگا، اس میں ہندوستان کے لوگوں کے خیالات بھی سامنے رکھے جائینگے، اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ حال ہی میں اتحادیوں اور ان کی حکومتوں کی طرف سے قسطنطنیہ پر ترکوں کے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرنے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، اس میں ہندوستان کی مسلمان رعایا کے مذہبی جذبات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ یہ مسئلہ اہم ہے، برطانوی حکومت بھی اس مسئلہ کو نظرانداز نہیں کرے گی لیکن برطانوی حکومت کے وزراء کے سامنے یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم نہیں ہے، ان کو اور بھی دوسری پیچیدگیوں کو سامنے رکھنا ہے، اس مسئلہ کے ساتھ اور بھی مسائل ہیں، آپ خود اچھی طرح واقف ہیں، ترکی امپائر کی رعایا کا خیال بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں کہ اس ملک پر سلطنت کے قتل عام پر بڑا تکلیف دہ ردعمل ہوا ہے، اسی لیے یہ مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے، پھر بھی برطانوی حکومت جس نتیجہ پر پہونچے گی، اس میں ہندوستان کی مسلم آبادی کی خیرسگالی کا خیال ضرور رکھے گی اور آپ یقین جانیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے حکومت اس پر مناسب طور پر غور کرے گی، مسٹر محمد علی! آپ نے اپنی تقریر کے الفاظ میں بڑی خوبی سے اس کی احتیاط کی ہے کہ دھمکی کی زبان استعمال نہ کیجائے، اور

آپ نے اس طرح دانشمندی سے کام لیا ہے، آپ کو قومی کاموں کے سلسلہ میں اس کا پورا تجربہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنی حکمت عملی میں تمام معاملات کو سامنے رکھتی ہے اور اس میں دھمکی سے ایک انچ کی تبدیلی نہیں کر سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ برطانوی امپائر کی وفادار رعایا مخلصانہ اور ایماندارانہ طور پر کوئی بات کہتی ہے تو حکومت اس پر پورے طور پر غور کرتی ہے، مجھکو افسوس ہے کہ اس وفد سے سکریٹری آف اسٹیٹ کی ملاقات نہیں ہوسکی، وہ ملنے کی خواہش رکھتے تھے، اور نہ ملنے سے ان کو مایوسی ہوئی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ اس وقت علیل ہیں، اسی لیے میں انکی نمایندگی کر رہا ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کے ہندوستان جانے سے پہلے آپ کو وزیر اعظم سے ملنے اور ان کے سامنے معاملات کو پیش کرنے کا موقع ملے گا، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ایک کانفرنس ہو رہی ہے، وزیر اعظم ڈاوننگ اسٹریٹ میں اتحادیوں کے مدبروں سے مل رہے ہیں اور بہت سے اہم معاملات زیر بحث ہیں، مسٹر لائڈ جارج اس وقت بہت مشغول ہو رہے ہیں، میں وعدہ نہیں کر سکتا ہوں کہ وہ آپ سے ملیں گے، لیکن مجھکو امید ہے کہ وہ آپ سے مل سکیں گے۔

حضرات! میں صرف ایک بات کہنے کو آیا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ایک فلسفی نے کہا ہے کہ تاریخ دوسری بہتر چیز کو قبول کرنے کا نام ہے، ہم جو کچھ چاہا کرتے ہیں، وہ تو سب نہیں حاصل ہوا کرتا، لیکن آپ یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ان خیالات پر مناسب طور پر ضرور غور کرے گی جو برطانوی امپائر کی رعایا کی طرف سے وفادارانہ اور مخلصانہ طور پر ظاہر ہوں گے،

مولانا محمد علی اس جواب سے خوش نہ تھے، بلکہ شاید تلملا اٹھے، اور وہ ان قائدین میں تھے جو اپنی تلملاہٹ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اس کا جواب دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی انگریزوں ہی کی طرح انگریزی زبان کے لفظوں، فقروں اور جملوں سے کھیل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ماہر تھے، اس لیے مسٹر فشر کو مخاطب کر کے بولے:

"کیا مجھکو اس شکریہ کے ادا کرنے کی اجازت ہے جو اس وفد کے استقبال میں وسعتِ قلب دکھائی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ہم میں ہر شخص سمجھتا ہے، ہندوستان کا ان پڑھ بھی سمجھ سکتا ہے کہ صرف ہماری خواہشات اور جذبات ہی کو اس قسم کے مسئلہ کو طے کرنے میں ملحوظ رکھا جائے گا، لیکن ایک بات ہے جس کی طرف بالکل توجہ نہیں دیجارہی ہے اور ہم لوگ اسی پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے بعض مذہبی اعتقادات ہیں جنکی نوعیت ایسی ہے کہ ہم ان ہی کو اولیت دینا پسند کرینگے، اور چونکہ ہماری وفاداری کا تعلق ان ہی مذہبی اعتقادات سے ہے اسلیے بادشاہ سلامت کی حکومت کو بھی ان مذہبی اعتقادات کو اولیت دینا چاہیے، یہ سچ ہے کہ زندگی دوسری بہتر چیز کے انتخاب کا نام ہے اور مفاہمت سیاست کا اہم جز ہے، اس کا احساس رکھتے ہوئے ہم نے اپنے مطالبات پیش کیے ہیں، اتحادیوں اور انکی حکومتوں کے بیان سے ہم کو امید ہو چلی تھی کہ ایک نئی دنیا اور نیا آسمان قائم ہونے والا ہے اور جن علاقوں پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کر لیا گیا ہے، ان کو ان کے جائز حقداروں کو واپس کر دیا جائیگا، اس طرح ہم یہ مطالبہ کرتے کہ مصر، طرابلس، بوسنیا، ہرزگووینا، کریٹ اور ترکی کے وہ علاقے جو بلقان کے علاقوں سے کاٹ لیے گئے ہیں، واپس کیے جائیں، لیکن ہم نے ایسا مطالبہ نہیں کیا ہے، گرچہ ہم کو ان علاقوں کے اپنے ہم مذہبوں سے پوری ہمدردی ہے، ہم نے اس طرح دوسری بہتر چیز کے انتخاب پر عمل کر دکھایا ہے، لیکن جہانتک مذہبی معاملات و اعتقادات کا سوال ہے، ان میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی، ان چیزوں پر مذکورہ فلسفہ کا اطلاق نہیں ہوتا، ان معاملات میں ہم اسی چیز کا انتخاب کرینگے جو بہترین ہے، ورنہ دوسری بہتر چیز کا انتخاب نہ صرف بد بلکہ بدترین چیز کے انتخاب کے برابر ہوگا،

"جہانتک وزیر اعظم سے ملاقات کی ہماری خواہش کا سوال ہے، انکی مشغولیت سے ہم اچھی طرح

واقف ہیں، اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کیلیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے، لیکن احترام پر حرف لائے بغیر ہم کو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مسٹر وے نی زیلوز بار بار آتے ہیں اور بادشاہ سلامت کی حکومت کو انکی باتوں پر کان دھرنے کا موقع مل جاتا ہے، تو پھر یہ بالکل مناسب ہوگا کہ ہندستان اور ہندستانی مسلمانوں کے نمایندوں کو جو بقول آپکے اتنی دور دراز سے آئے ہیں، کہنے سننے کا موقع دیا جائے، تاکہ بادشاہ سلامت کے وزرا فیصلے کرنے سے پہلے ہمارے جذبات سے بھی واقف ہو جائیں۔

"جہانتک سلیشیا کے قتل عام کا تعلق ہے ہم لوگوں کو یقین ہے کہ اسکی خبروں کے آنے کے ذرائع قابل اعتماد نہیں، ہم تو اسکے قائل ہیں کہ اس قتل عام کی مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے، ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ اصلیت کا پتہ لگایا جائے، یونانیوں، یہودیوں اور آرمینیوں نے اپنے اپنے کمیشن بھیجدیے لیکن ہندستانی مسلمانوں کو اپنا کمیشن بھیجنے سے روکا جا رہا ہے، انکو بھی ایک کمیشن بھیجنے اجازت دیجائے، اور اگر انکی غیر جانبداری قابل شبہہ سمجھی جائے تو اس کمیشن میں انگریز اور ہندوستانی بھی شریک کیے جائیں، اور اس میں شریک ہونے میں بڑا سا بڑا آدمی بھی اپنے رتبہ سے فروتر نہ سمجھے گا، ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام اور ہندوستان کے دوسرے والیانِ ریاست، علما جن میں مولانا عبدالباری اور مولانا محمود الحسن بھی ہوں گے، ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں رہنما بھی خوش ہونگے کہ اس کمیشن کے ذریعہ صداقت کا اظہار ہوا، پہلے مکمل تحقیقات تو ہونے دی جائے، اگر ترک ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ وہ بدنام کیے جا رہے ہیں، تو ہم لوگ ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، ہماری خواہش کبھی یہ نہ ہوگی کہ اسلام پر یہ داغ آئے کہ وہ قاتلوں کا حامی ہے،

"میں آپ کی اجازت سے آپ کی توجہ ایک بات کی طرف اور دلاؤں، وزیر اعظم اور دار العوام کے لیڈر کی تقریروں میں خلیفہ اور اس کے دار الخلافت اور آبنائے میں اتحادیوں کی فوجوں کے قیام کا ذکر آیا ہے، اس کا ہم کو احساس ہے کہ پارلیمنٹ کے مباحثے

میں خصوصاً اور سیاست میں . . . . مدبروں کو ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں کہ مختلف رائے رکھنے والے مطمئن رہیں، یہ مدبرین اپنی رائے کے اظہار میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو نجی طور پر کہنا پسند نہ کریں گے، لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ کو اتحادیوں کی بندوقوں کے سایہ میں قسطنطنیہ میں رکھا جائے گا، جہاں اس کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق رہے گا، تو پھر اس کی پوزیشن ویٹکین کے پوپ سے بھی بدتر ہوگی، وہ اوگینون کا پوپ بلکہ اس سے بھی بدتر بن کر رہے گا، اور ایک غیر مذہب اور غیر عقیدہ والوں کا قیدی ہوگا، اگر یہ اصلیت ہے تو پھر ہم اس کو بار بوسہ یا قونیہ میں جلاوطن ہوجانا زیادہ پسند کریں گے، لیکن اسلام کی جو تذلیل اس سے ہوگی اسکا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کے نتائج کو نظر انداز کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔"

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس موقع ایک مختصر تقریر کی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنی بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاید پہلا ہندوستانی مولوی ہوں جو یہاں آیا ہوں، میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، مولانا عبدالباری صاحب نے جو لکھنؤ کے فرنگی محلی کے مشہور خاندان سے ہیں، مجھکو خاص طور پر اپنی نمایندگی کرنے کے لیے بھیجا ہے، تاکہ میں بادشاہ سلامت کی حکومت پر واضح کردوں کہ ہم لوگوں کے لیے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ خالص ایک مذہبی معاملہ ہے،

رائٹ آنریبل فشر سے وفد کی یہ پہلی ملاقات ختم ہوگئی، اسکے بعد انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں مولانا محمد علی نے جس جرأت اور مذہبی جوش سے تقریر کی، وہ بھی مطالعہ کے لائق ہے، یہ تقریریں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں لیکن انکے اندر جو چنگاریاں ہیں وہ آج بھی مسلمانوں کے جذبات کو سلگانے میں کام دے سکتی ہیں، (باقی)

کیا علامہ ابن حبان پر زندقہ کا الزام صحیح ہے؟

از

ازضیاء الدین اصلاحی

امام ابو حاتم محمد ابن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) اکابر محدثین میں ہیں، علوم حدیث خصوصاً فن جرح و تعدیل کے ماہر اور متعدد فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:-

"فقہ و لغت و طب و نجوم و فلک و ہندسہ نیک می دانست"[1]

لیکن بعض نامور علماء و ائمہ حدیث کی طرح ان پر بھی کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا الزام زندقہ اور بدعقیدگی کا لگایا گیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، اس مضمون میں اس کا جائزہ لیا جائے گا، اور اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس الزام کا دار و مدار ان دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:-

---

[1] بستان المحدثین

قال سألت یحییٰ بن عمار عن ابی حاتم بن حبان فقال رأیته ونحن اخرجناه من سجستان کان له علم کثیر ولم یکن له دین کبیر قدم علینا فانکر الحد لله فاخرجناه[۱]

ابو اسماعیل ہروی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن عمار سے ابو حاتم بن حبان کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے، اور ہم ہی لوگوں نے ان کو سجستان سے جلاوطن کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے مگر ان کا دینی پایہ زیادہ بلند نہیں تھا، وہ ہمارے پاس آئے، اور اللہ کے بارہ میں حد کا انکار کیا، تو ہم نے اُن کو شہر بدر کر دیا،

دوسری روایت ہے:-

قال ابو اسماعیل الانصاری سمعت عبد الصمد بن محمد ابن محمد یقول سمعت ابی یقول انکروا علی ابن حبان قوله (النبوة العلم والعمل) و

ابو اسماعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں نے عبد الصمد سے اور انھوں نے اپنے والد محمد سے سُنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوة العلم و العمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کی وجہ سے ان پر نکیر کی، الحاد و زندقہ کا الزام[۲]

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و ۱۳۵، و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۵ و طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ ۲ اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک (بقیہ حاشیہ ص ۳۵۵ پر دیکھئے)

حکموا علیه بالزندقة وهجروه وکتب فیه الی الخلیفة فامر بقتله وسمعت غیره یقول لذلك اخرج الی سمرقند[۱]

لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے اُن کی شکایت کی، خلیفہ نے اُن کے قتل کا حکم دیا (ابو اسماعیل کہتے ہیں، مگر) میں نے عبد الصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کئے گئے تھے،

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی دینی فضیلت و برتری میں کلام کیا گیا ہے، اور دوسری روایت میں اُن کے الحاد و زندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے، اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعۃً قتل کئے گئے تھے یا نہیں[۲] پھر فرمان قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک و تذبذب ظاہر کر کے روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، اس سے اس کا سوء حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے،

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں اُن کا کمال مسلّم ہے، مگر روایت و درایت میں ضبط و تیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے، علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں، ان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۴) نبوت کا حد بنا علم و عمل ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہو سکتا ہے، گویا نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہے[۱] میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۳۹ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۵ و لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۳

۲ شاہ عبد العزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعۃً قتل نہیں کئے گئے تھے، بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرا دیا تھا،

احتمالات کی موجودگی میں ابنِ حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابنِ حبان کی وفات کے درمیان، چالیس بیالیس سال کا فرق ہے، اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہوچکا ہوتا، اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابنِ حبان کے معاصرین بھی ہوتے، کیونکہ ان کا شمار ائمۂ حدیث اور جرح و تعدیل میں ہوتا ہے، اس لئے دوسرے اربابِ فن اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے، لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی اُن کی شہرت و اہمیت، وثوق و اعتبار اور عظمت و بلند پایگی میں فرق نہ آنا اور اُن کی ذات کا محدثین اور ائمۂ فن کا مرکزِ توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا اُن کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں[1]،

ان روایتوں کے ناقابلِ یقین ہونے ہی کی بنا پر اُن کو بعض اربابِ سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، اور جن مورخین نے اُن کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے، درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کئے جاسکتے جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے انکی پوری تصدیق نہ ہوجائے دونوں روایتوں کے اختلاف و اضطراب اور ان میں خطا و تحریف کے احتمالات کو نظرانداز کرکے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے، تو ابنِ حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوسکتا، اس کی تفصیل یہ ہے:-

---

[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے وہ ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے،

اوپر گذر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت و جلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے حد و حیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد و مکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطۂ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں۔

انظرھا اجھل ھذا الجارح	ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا
ولیت شعری من المجروح،	بھی کس قدر ناواقف ہے، کاش میں
مثبت الحد للہ اونافیہ،	بھی جانتا کہ دونوں میں قابلِ جرح
	والزام کون شخص ہے؟ آیا وہ جو اللہ
	کے لئے حد کو مانتا اور ثابت کرتا ہو
	یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے،؟

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے۔

یا للہ العجب من احق بالاخراج	مجھ کو سخت تعجب ہے، آخر جلاوطنی کی
والتبدیع وقلۃ الدین[1]،	سزا اور بدعت اور دین میں ضعف
	کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے،

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

وقولہ (بدت) من ابن حبان	معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے
ھفوۃ طعنوا فیہ بھا ان	کوئی ایسی لغزش سرزد ہوگئی جس کی

ارادالقصة الاولی التی صدر بها کلامہ فلیست ھذہ بمفوۃ والحق ان الحق مع ابن حبان فیھا[۲]

وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے، اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت[۱] والا قصہ ہے تو در اصل اس میں کوئی لغزش نہیں ہے، بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف برحق ہے،

ان اقوال سے ظاہر ہو گیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابلِ اعتراض بات نہ تھی، بلکہ ان ہی کا نقطۂ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیونکہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور و خوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدا کی صفات وغیرہ میں بحث و تدقیق فضول اور لایعنی بات تھی، اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال و تفتیش اور بحث و جستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:-

انکارہ الحد واثباتکم للحد نوع من فضول الکلام والسکوت عن الطرفین اولیٰ اذلم یأت نص بنفی ذلک ولا اثباتہ و اللہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیئ فمن

ابن حبان کا اللہ کے لئے حد ہونے کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کیلئے حد کو ثابت کرنا دونوں ہی فضول باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی افضل و اولیٰ ہے، اس لئے کہ نفی و

---

[۱] یعنی وہ روایت جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے،

[۲] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴،

اثبتہ قال لہ خصمہ جعلت للہ حدا ابرأیک ولا نص معک بالحد والمحد ود مخلوق تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا وقال ھو للنا فی ساویت ربک بالشئی المعدوم اذ المعدوم لا حد لہ فمن نزہ اللہ وسکت سلم وتابع السلف[۱]

اثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے، اور اللہ کا یہ حال ہے کہ اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں پس جو شخص حد کا قائل ہے، اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے و قیاس سے اللہ کے لئے حد بنائی ہے، اس کے لئے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے، (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے حالانکہ) محدود مخلوق ہوتا ہے، اور اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے، مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم چیزوں کے برابر کر دیا ہے،[۲] کیونکہ معدوم چیزوں کے لئے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھے اور ان امور

---

[۱] حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد اس کے لئے حد کی نفی اس کو معدوم اشیاء کے برابر کر دینا نہیں ہو سکتا۔ [۲] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴، و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۳۹،

کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں
وہی سلف صالحین کے متبع ہیں اور
اور انہی کا طریقہ احتیاط اور سلامتی
پر مبنی ہے،

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت و منکر دونوں ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بناکر غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط و تورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں،

کلاقسما مخطی اذ لم یات نص باثبات الحد ولا بنفیہ ومن حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ [1]	اثبات و انکار دونوں کے قائلین غلطی کرتے ہیں، کیونکہ حد کی نفی و ثبوت کے متعلق کوئی نص نہیں ہے، اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے،

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا،

(۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بحث بنایا، جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا، لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں،

مگر مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلا ضرورت اس مسئلہ میں کلام

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵،

نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے،

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور و خوض نامناسب اور خلاف احتیاط ہے، لیکن اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور و خوض اور بحث و کلام کیا جائے، لیکن ضرورۃً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، اُن کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا تھا، اور کچھ لوگ شد و مد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے حد و حیز ثابت کر رہے تھے، اس لئے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا، اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی، اس لئے انھوں نے کوئی خلاف احتیاط نہیں کام کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمد کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارہ میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث و تفتیش فضول، سوال و تجسس بدعت، اور خاموشی افضل و اولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہی جواب دیا، اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے اس کے بارہ میں دریافت کیا، تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا، اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا [1] مگر جب معتزلہ کے استیلاء و تسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر و تشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا، اور ابتلا و آزمائش کی پرواہ کئے بغیر بڑی جرأت و بے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے قید و بند اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا،

[1] احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۳۳،

یہی دوسری روایت تو اس میں الحاد و زندقہ کا ضرور ذکر ہے، مگر اس کی جو وجہ بیان کی گئی ہے، اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر و ایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف اور تامل سے کام لیتے ہیں، اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے، اور جہاں تک ممکن تھا، توجیہ و تاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابنِ حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدِ نظر رکھا ہے، اُن کی توجیہ و تاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کئے جاتے ہیں :-

علامۂ ذہبی رقمطراز ہیں :-

وھذا ایضاً لہٗ محمل حسن و لم یرد حصر المبتدا فی الخبر و مثلہ الحج عرفۃ فمعلوم ان الرجل لا یصیر حاجاً بمجرد الوقوف بعرفۃ وانما ذکر مھم الحج و مھم النبوۃ اذا کمل صفات النبی العلم و العمل ولا یکون احد نبیاً الا ان یکون عالماً عاملاً (نعم) النبوۃ موھبۃ من اللہ تعالیٰ لمن اصطفاہ من اولی العلم والعمل لا حیل للبشر فی اکتسابھا

(دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے، درحقیقت ابنِ حبان کی مراد مبتدا کو خبر میں محصور و محدود کرنا نہیں ہے، جس طرح کہ رسول اکرم کے ارشاد (الحج عرفۃ یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائگی کے لئے صرف عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے، اور نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان و مناسک ادا ہو جائیں گے، بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب اہم، ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے،

ابداً او بھا یتولد العلم النافع و العمل الصالح ولاریب ان اطلاق ما نقل عن ابی حاتم لا یسوغ و ذٰلک نفس فلسفی[1]

(اسی طرح ابن حبان کے قول کا منشاء یہ ہے کہ) نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و امتیاز ہے، اور کوئی شخص ان میں درجہ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبت الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے جس کے لئے اللہ اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے، اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جا سکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے (اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابنِ حبان کے قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آئیگی) البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ مداے خیال کی ہے،

حافظ ذہبی اور علامہ ابنِ حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے :-

ولقولہ ھذا محمل سائغ ان

ابنِ حبان کے اس قول کی ایک

لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵،

كان عناه اى عماد النبوة
العلم والعمل لان الله
لم يوت النبوة والوحي
الا من اتصف بهذين
النعتين وذلك لان النبي
يصير بالوحي عالما ويلزم
من وجود العلم الالهي العمل
الصالح فصدق بهذا الاعتبار
قولهم النبوة العلم اللدني و
العمل المقرب الى الله فالنبوة
اذا تفسر بوجود هذين الوصفين
الكاملين ولا سبيل الى تحصيل
هذين الوصفين بكمالهما
الا بالوحي الالهي اذ الوحي
الالهي علم يقيني ما فيه ظن
وعلم غير الانبياء منه
يقيني واكثره ظني، ثم
النبوة لازمة للعصمة
ولا عصمة بغيرهم ولو بلغ

مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر اُن کی مراد
یہ ہو کہ نبوت کا دارومدار علم و عمل پر ہے
کیونکہ اللہ تعالیٰ نبوت و وحی سے اسی
شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں
اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی
وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علمِ الٰہی عمل
صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے
اُن کا قول صحیح ہے کیونکہ نبوت علمِ لدنی
اور اُن اعمال کا نام ہے جو قربِ الٰہی کا
ذریعہ ہیں پس نبوت ان دونوں چیزوں
کے تمام و کمال پائے جانے کا نام ہے
اور وحیِ الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجۂ
کمال حصول نہیں ہو سکتا کیونکہ وحیِ
الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن و تخمین
کو دخل نہیں ہوتا، مگر غیر انبیاء کا علم،
یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت
عصمت کو مستلزم ہے اور انبیاء کے علاوہ
کسی شخص کے لئے عصمت نہیں خواہ وہ
علم و عمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب

في العلم والعمل ما بلغ والخبر
عن الشيء يصدق ببعض
اركانه واهم مقاصده
غيرانا لا نسوغ لاحد اطلاق
هذا الا بقرينة كقوله عليه
الصلوٰة والسلام الحج عرفة
وان كان عنى الحصر اى ليس
هي الا العلم والعمل فهذه
زندقة وفلسفة، [illegible]

کیوں نہ طے کر لے، (دوسری بات یہ ہے
کہ جب کسی چیز کے بارہ میں خبر دیجاتی ہے
تو وہ اُس کے ضروری مقاصد اور اہم
اجزاء کے لحاظ سے دیجاتی ہے جس طرح
کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ (الحج عرفۃ) تاہم
کسی کے لئے اس طرح کی بات (جیسی ابن
حبان نے کہی ہے) مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا
درست نہیں ہے، اور اگر ابن حبان کا مقصد
حصر ہو یعنی نبوت صرف علم و عمل ہی کا
نام ہے، تو یہ بلاشبہ زندقہ اور فلسفہ ہے

اس کے متعلق شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کی تقریر بھی قابلِ ملاحظہ ہے، وہ
فرماتے ہیں:-

لیکن انصاف آنست کہ این کلامِ
چنداں دور از عقائد حقہ نیست چہ مرادِ
آن نیست کہ نبوت کسبی است بریاضت
در علم و عمل حاصل تواں کرد، چنانچہ
مذہب فلاسفہ ہست بلکہ غرض او آنست
کہ نبوۃ را لازم است کہ نفس ناطقہ انسانی

مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان
کا یہ قول عقائدِ صحیحہ کے چنداں خلاف
نہیں ہے کیونکہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا
کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم و عمل کی
ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ
فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ اُن کی غرض

۱؎ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳، و ۱۱۴،

در علم و عمل زیادتی بین داشتہ باشد بعد ازاں بطریق موہبت او را نبوت عطائی شود چنانچہ در قرآن مجید اشارہ باں معنی می فرمائید جائے کہ فرمودہ است اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ و اعتقاد آں کہ انبیاء را ہیچ مرتبہ در قوت علمیہ و عملیہ بر سائر افراد نمی باید کہ باشد و بطریق تحکم محض یکے را از میان افراد متساویہ بہ نبوت سرافراز میفرمائید اصلا از شریعت و دین ثابت نمی شود یا مرادش آنست کہ انبیاء را بعد از بخشش نبوت تفوق در ہر دو جانب علم و عمل حاصل می گردد، ولہذا معصوم می باشند از خطا و گناہ، و این معنی مجمع علیہ جمیع اہل اسلام است۔[1]

یہ ہے کہ نبوت کے لئے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم و عمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو اس کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی مفہوم کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، (اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت و نبوت سے کسی کو سرفراز کرے) رہا یہ عقیدہ کہ انبیاء علیہم السلام کو علمی و عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی، بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے، یا ابن حبان کا یہ بھی منشا ہو سکتا ہے کہ کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت عطا کئے

[1] بستان المحدثین ص ۴۰

جانے کے بعد علم و عمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی ہے اس لئے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں، تو یہ ایسی بات ہے [illegible]

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام و اعتراض اور الحاد و بدعقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوء تعبیر کہا جا سکتا ہے، البتہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوء تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے، اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم و فن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین و طباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا، اور وہ اُن کو مطعون و متہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے انکے لئے اس کا موقع فراہم کر دیا، اور انھوں نے اگی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق و سباق سے جدا کر کے اسے انکا الحاد و زندقہ قرار دیا حاکم فرماتے ہیں:

"ابو حاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا"[1]

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:-

"بجز عناد و تعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، وہ یگانۂ روزگار اور غیر معمولی ذہین و طباع تھے، اُن کا حافظہ بے مثال تھا"[2]

۲۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فلسفہ و کلام کے ماہر اور فلسفیانہ و متکلمانہ مذاق رکھتے تھے، اور فلسفہ و کلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد و خیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے اس بنا پر متقشف علماء کو ابن حبان سے بدگمانی ہو گئی، اور وہ ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے، علامہ

[1] [illegible]

[2] [illegible] لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۳ [illegible]

سیوطی کا بیان ہے کہ "وہ فلسفہ و کلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لئے ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے" حالانکہ فلسفہ و کلام سے فساد عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود دینی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ و کلام میں انہماک نے اُن کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لئے ابن حبان کے فلسفہ و کلام کی دلچسپی کو بھی ایمان و عقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، تاآنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو،

۳- ابن حبان پر اتہام و الزام کی روایت کرنے والے ابو اسماعیل انصاری ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے، اس لئے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ و کلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فروگذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا، اور انھوں نے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگا دیا، اس لئے یہ الزام درحقیقت ان کے غایت تورع کا نتیجہ ہے، جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے،

تذکرۃ المحدثین

(حصۂ اول)

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام جن میں صحاح ستہ کے تمام مصنفین بھی داخل ہیں، مثلاً امام مالک امام ابو داؤد طیالسی، امام عبدالرزاق بن ہمام، امام عبداللہ بن زبیر حمیدی، امام ابوبکر بن ابی شیبہ امام اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل، امام عبداللہ دارمی امام بخاری، امام مسلم، امام ابن ماجہ امام ابو داؤد سجستانی، امام ترمذی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و سوانح اور انکی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی، رفیق دار المصنفین، (ضخامت ۳۰۴ قیمت: قیمت ۵۰؍ روپے)

"منیجر"

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم ماخذ

از

جناب الطاف حسین خان صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۴)

(۴) ہندی قرون وسطیٰ کے شعرا اور انکا کلام

ہندی قرون وسطیٰ کے فارسی شعراء کا جہاں تک تعلق ہے، امیر خسرو ان میں سر فہرست ہیں، ان کے اشعار میں تیرہویں صدی کے ہندوستان کے جو حالات ملتے ہیں وہ مستند مورخوں کے تاریخی بیانات سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں، خسرو کی تاریخی مثنویوں میں نہ سپہر، قران السعدین، دولرانی خضر خاں، تغلق نامہ اور مفتاح الفتوح وغیرہ شعر و سخن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کے سماجی اور تاریخی واقعات کی آئینہ دار ہیں، جنکو سید حسن برنی نے "تاریخی نقاشی" کے نام سے تعبیر کیا ہے، ان مثنویوں کو گہری نظر سے پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو نے اپنے عہد کے تمدن کی جزئیات تک کو نہیں چھوڑا ہے ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی — ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

ان کے تاریخی کارناموں کے متعلق مورخین اور محققین کے خیالات ملاحظہ ہوں،

(۱) پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:

"انھوں نے دلی کا ہر رخ سے معائنہ کیا، یہاں کے واعظین کی خطابت اور صوفیہ کے پُرکیف مکالمے ہوں یا یہاں کی رقاصاؤں کے دلربایانہ عشوے، انکی نظر سے نہیں بچے، جب انھوں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو گہرے سے گہرے انسانی جذبات

سے ان کا دل مملو تھا، شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر گوشۂ خرمنے آفتم

خسرو نے اپنے پیشرو کی تقلید کی اور دربار سے لیکر مزدور کی گلیوں تک، خانقاہوں سے لیکر خرابات تک معاشرت انسانی کی تمام تہ بہ تہ حالتوں کا مطالعہ کیا۔[1]"

(۲) ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:

"شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے، اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے، خسرو اس قوم کے بہترین نمونوں میں سے ہیں، انکے کلام میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا ابھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے، راہ عشق کے پیچ و خم، محبت کے معاملوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ، پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے، جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔[2]"

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:-

"آج کا مورخ جب ہندی قرون سے اسکے بہترین تہذیبی نمونے کے متعلق سوال کرتا ہے تو جواب میں "امیر خسرو" ہی کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔[3]"

(۴) تغلق نامہ کے دیباچہ نویس لکھتے ہیں:-

---

۱ سوانح حیات امیر خسرو (اردو ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۷، ۲ امیر خسرو اور ہندوستان، خسرو اکیڈمی، نئی دہلی ص ۱۳، ۳ تاریخی مقالات، دہلی، ۱۹۶۶ء ص ۸،

"شاید دنیا کی کسی قوم نے ایسا شاعر نہیں پیدا کیا جس نے طویل اور اہم تاریخی واقعات کو شاعرانہ حسن گفتار کے ساتھ اتنی صحت سے نظم کا جامہ پہنانے میں کامیابی پائی ہو، جیسے کہ پرانی دہلی کے اس درباری شاعر کے حصے میں آئی۔[1]"

(۵) ڈاکٹر وحید مرزا نے صحیح فرمایا ہے:

"انکے زمانے کی تقریباً مکمل تاریخ ان ہی کی تصانیف سے مرتب کی جاسکتی ہے۔[2]"

یہی نہیں بلکہ تاریخ کے بعض واقعات صرف خسرو ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً خان شہید کا مرثیہ جس کو فارسی شاعری کا "دُرِّ یتیم" کہا جاتا ہے، اسکے بارے میں پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:

"شہزادہ شہید کی فوج کشی، مغلوں سے مقابلہ اور پھر اسکی شہادت، امیر خسرو کی گرفتاری اور رہائی، ان تمام واقعات کا تفصیلی علم ان کے زمانے میں عوام و خواص دونوں کو اور ہمارے زمانے میں تاریخ کے طلبہ کو صرف اسی مرثیہ سے ہوا ہے۔[3]"

خسرو کے علاوہ ہندی قرون وسطیٰ کے فارسی شعراء میں بہاء الدین اوشی، امیر روحانی، محمد عوفی، ناصری خراسانی، بدر چاچ، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، شمس دبیر، مولانا مطہر کڑہ، شیخ جمال الدین ہانسوی، امیر حسن علا سجزی، مولانا ضیاء الدین نخشبی، مولانا عصامی اور شیخ جمالی کے اشعار میں بھی ہندی قرون وسطیٰ کے تمدنی، ادبی اور سیاسی حالات ملتے ہیں،

وہ گمنام شعراء جن کا سرمایۂ حیات مفقود ہو چکا تھا، مگر اب دستیاب ہو گیا ہے، عجب نہیں کہ ان میں بھی تاریخی و سماجی واقعات کی داستانیں ہوں، ان شعراء میں سراجی، عمید تولکی، برہان الدین بزاز، تاج الدین بخاری، اعز الدین علوی، حکیم تاتاری اور محمود خطاط جو سلاطین دہلی

---

۱ تغلق نامہ، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء ص ۳-۴، ۲ امیر خسرو (ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۴،

۳ سوانح حیات امیر خسرو دہلوی (ترجمہ) ص ۲۱

کے عہد کے شعراء تھے۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ میں انکے کلام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۵۔ تاریخی اور ادبی مخطوطات کی اشاعت | اسلامی ہندوستان میں ساڑھے چھ سو سال کے عرصہ میں سیکڑوں تاریخی اور ادبی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ان میں سے بہت سی ضائع ہوچکی ہیں اور ضائع ہورہی ہیں، لیکن اب بھی ایک بڑی تعداد ان قلمی کتابوں کی ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے کتب خانوں میں محفوظ ہے، گو اہم تاریخی ماخذوں کی اچھی خاصی تعداد شائع ہوچکی ہے، پھر بھی دنیا کے مختلف کتبخانوں میں ایسے بہت سے مخطوطے موجود ہیں جنکی اشاعت ہندی قرون وسطیٰ کے تاریخی معلومات کے لیے نہایت ضروری ہے، چند اہم تاریخی مخطوطات جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ظفرنامہ فیضی یا فتحنامۂ گجرات، برٹش میوزیم لندن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، (۲) شاہجہاں نامہ، محمد امین قزوینی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۳) تاریخ حقی یا ذکر الملوک شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ایضاً (۴) فوائد فیروزشاہی، مولانا شرف محمد العطائی، ایضاً، بانکی پور (۵) طبقات شاہجہانی، شیخ محمد صادق، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۶) ذخیرۃ الملوک، سید علی ہمدانی، ایضاً (۷) مآثر جہانگیری، کامگار حسین، انڈیا آفس لندن (۸) اخلاق جہانگیری، نورالدین محمد، ایضاً، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۹) تکملہ سیر المتاخرین یا تاریخ سلاطین بنگالہ منشی غلام حسین خاں جونپوری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۰) بادشاہ نامہ، محمد امین قزوینی، برٹش میوزیم لندن (۱۱) افسانہ شاہان، محمد کبیر بن شیخ اسمٰعیل، ایضاً (۱۲) تذکرۃ الواقعات[1] جوہر آفتابچی، ایضاً (۱۳) تاریخ چغتائی، محمد شفیع، ایضاً (۱۴) زبدۃ التواریخ، محمد نورالحق محدث، ایضاً، آصفیہ حیدرآباد (۱۵) ہفت گلشن محمد شاہی، ہادی کامور خاں، برٹش میوزیم،

[1] ڈاکٹر معین الحق نے اس کا اردو ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے شائع کردیا ہے۔

(۱۶) واقعات مشتاقی، مولانا رزق اللہ مشتاقی، برٹش میوزیم (۱۷) تاج المآثر حسن نظامی نیشاپوری، آصفیہ لائبریری حیدرآباد (۱۸) سیرت فیروزشاہی، مصنف گمنام، بانکی پور لائبریری (۱۹) فتحنامۂ نورجہاں، ملا کامی شیرازی، کتبخانۂ ملی پیرس (۲۰) سبع الاخبار، محمد شریف وقوعی، انڈیا آفس لائبریری (۲۱) تذکرۃ الامراء، کیول رام، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲۲) تاریخ ہند محسنی، میر محمد محسن، ایضاً (۲۳) قواعد سلطنت شاہجہانی، چندربھان برہمن، ایضاً (۲۴) تاریخ مظفری، محمد علی خاں انصاری، ایضاً (۲۵) تاریخ عالمگیری، احمد علی صفوی، ایضاً (۲۶) تاریخ وقائع زمان شاہی، مرزا ابوالحسن خاں ایضاً (۲۷) تاریخ حسینی، امام الدین، ایضاً (۲۸) تزک شاہ شجاع دفتر اول، دوم، سوم دفتر اول و دوم مرتبہ شاہ شجاع، دفتر سوم مرتبہ محمد حسن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ۔ (۲۹) تاریخ احمد شاہ (حالات احمد شاہ عالمگیر ثانی) مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، (۳۰) تاریخ محمد شاہی یا نادر الزمانی، منشی خوشحال چند، ایضاً (۳۱) تاریخ محمد (عادل شاہی) محمد ظہور پسر ملا ظہوری، ایضاً (۳۲) مظفرنامہ تاریخ بنگالہ، کرم علی خاں، ایضاً

ان تاریخی قلمی نسخوں کے علاوہ ان ادبی اور مذہبی کتابوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، جن کے قلمی نسخے لندن، پیرس، برلن اور روسی ترکستان کے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، یہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اس کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان ادبی و مذہبی قلمی نسخوں سے بڑا اہم تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے، مثلاً ہم ہندوستان کے لسانی اور ادبی ارتقا سے آگاہ ہوتے ہیں، مذہب اور تمدن کی حقیقی صورت ہمیں نظر آتی ہے، خانقاہوں اور مساجد کے آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، ان کا انداز گفتگو، ان کی نیک صحبتیں اور ان کا طرز سخن معلوم ہوتا ہے، غرض ان سے

تاریخی اور تمدنی معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند غیر مطبوعہ ادبی اور مذہبی نسخوں کے نام یہ ہیں:

(۱) سراج الہدایت، احمد علی علوی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲) مرأۃ الاسرار عبدالرحمن چشتی، ایضاً (۳) ریاض الاولیاء، بختاور خاں، برٹش میوزیم لندن (۴) احسن الاقوال، خواجہ عماد بن حماد کاشانی، ذخیرہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم (۵) تحفۃ المجالس شیخ احمد کھتو، انڈیا آفس لائبریری (۶) مخ المعنی امیر حسن علاء سجزی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۷) طوالع الشموس، قاضی حمید الدین ناگوری، ایضاً (۸) بحر المعانی، سید محمد بن جعفر مکی الحسینی، ایضاً (۹) مبلغ الرجال، عبداللہ عبیداللہ بن خواجہ باقی باللہ، ایضاً (۱۰) فتاوائے جہانداری، ضیاء الدین برنی، انڈیا آفس لائبریری (۱۱) فتاوائے فیروز شاہی مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۲) فقر بابری، نور الدین ابن قطب الدین، کتبخانہ دار المصنفین اعظم گڈھ (۱۳) نظم گزیدہ، ناظم تبریزی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۴) خلاصۃ الاشعار، تقی کاشی، ایضاً (۱۵) مخزن الغرائب، علی احمد خاں سندیلوی، ایضاً (۱۶) دیوان مولانا مطہر کڑہ، ایضاً (۱۷) دیوان نور العین، مسعود بک، برٹش میوزیم لندن (۱۸) عرفات عاشقین، تقی بن معین الدین حسینی اوحدی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲۰) مثنوی مہر و ماہ، شیخ جمالی، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (۲۱) چہار گلشن، منشی چترمن کالستھ، انڈیا آفس، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ (۲۲) سفینۂ خوشگو، بندرابن خوشگو، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

حرفِ مدعا

یہ کہہ کر آتے آتے رک گئی صبح بہار اپنی
ابھی تو راہ میں ہنگامۂ شیخ و برہمن ہے

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جب ہم نے اپنی قومی املاک کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا[۱]

لہ تاریخی مقالات مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۶۶

کہ ہمارے بہت سے قیمتی ذخائر یہاں سے منتقل کیے جا چکے ہیں، مغلوں کے محلوں اور مقبروں کے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء انگلستان کے خزانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، ہمارے فنون لطیفہ کے شاہکار انگلستان کے گھروں کی زینت ہیں، اور ہماری لاتعداد قیمتی قلمی کتابیں انڈیا آفس لائبریری کے نام سے ملک بدر کی جا چکی ہیں،

آیئے اب اپنے نقصانات کی فہرست مرتب کریں، جو انگریزوں کے ظالمانہ تدبر سے ہم ہندوستانیوں کو پہنچے،

(۱) ہندو مسلم درویشوں کا وہ مشن جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچ رہا تھا، اور اس سرزمین کو مہر و محبت کا گہوارہ بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا انگریزوں نے اس کو ناکام بنا دیا،

(۲) ہمارے ملک کی وہ قومی اور سیاسی تحریکیں جن کو سلطان ٹیپو اور جھانسی کی رانی نے اپنے خون سے سینچا تھا، سرد پڑ گئیں،

(۳) ہندو مسلم عوام کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی،

(۴) ہمارے سماج کی تمام خوبیاں جو بہادری، ایمانداری، حق گوئی، رواداری اور سچائی پر مشتمل تھیں، خوشامد، بزدلی، جھوٹ، مکاری اور قوم فروشی میں تبدیل ہو گئیں،

(۵) اس منافرت سے ہمارے ملک کو اتنا نقصان پہنچا کہ شاید سو برس کی مسلسل جنگ سے بھی اتنا نقصان عظیم نہ پہنچتا اور آج بھی ہم اپنی نادانی اور غفلت سے اپنے قومی اثاثے کو آگ لگانے اور تباہ کرنے میں مصروف ہیں،

اسلیے اپنے ہندوستانی مورخوں، استادوں اور اسکالروں سے ہماری استدعا ہے کہ موجودہ دور ہماری قومی اور ملی زندگی کا بڑا نازک دور ہے، ہم کو اس وقت

انگریز مورخوں کی لگائی ہوئی آگ کو حق و انصاف سے اور سچائی و رواداری سے بجھانا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اپنے ایک خطبہ میں مورخین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"آپ یہ سمجھیے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنانا ختم ہو چکا ہے، آج بھی یہ رجحان باقی ہے، اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی، اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے، آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جد و جہد کرنی ہے، تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے، لیکن ان میں ایک مشترک خطہ بھی تھا، جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے، جسے تاریخی نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں

ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں، ....

آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے، کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے، جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے، اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے جس کے صدر دروازہ پر حآلی کی یہ رباعی رقم ہو۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں [1]

آخر میں ڈاکٹر تاراچند کی تقریر کا ایک حصہ سنا کر گفتگو ختم کرتا ہوں، ڈاکٹر صاحب خسرو اکیڈمی نئی دہلی کے ایک جلسہ (۱۹۶۲ء) میں فرماتے ہیں:-

"آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا، اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیاد مان کر ایک دوسرے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں، اسی شک و شبہہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ

[1] خطبہ افتتاحیہ جشن طلائی شبلی اکیڈمی، دار المصنفین اعظم گڈھ، معارف جولائی ۱۹۶۹ء ص ۶۰-۶۲

خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں، چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے، تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیے غور نہیں کیا، تاریخ قوم کی لمبی اور ہیجانی سرگذشت کی یاد ہے، اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے، جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں، اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وجدانی سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے تاریخ دانوں کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے، اپنی روایتوں کی غلط تفسیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر سکتی ہے، اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لیے بدبختی کا باعث ہوئے اور اگر اب بھی ہم نہ چیتے تو آیندہ کے لیے سخت نقصان پہنچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔" (امیر خسرو اور ہندوستان ص ۶-۵)

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

اس میں امیر خسرو کی مثنویوں اور دواوین سے اُن کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق اُن کے تمام تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور آخر میں اُن کی مثنویوں اور دواوین کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں، جن سے اس عہد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے،

(ضخامت: ۱۴۶ صفحے - قیمت :- ۵،۲۵)

منیجر

کلکتہ کا ایک علمی سفر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس سال ۱۲ ستمبر کو کلکتہ کی ایران سوسائٹی میں ڈاکٹر محمد اسحاق میموریل لکچر کے سلسلہ میں ایک مقالہ پڑھنے کی عزت حاصل ہوئی، اس سوسائٹی نے گذشتہ پچیس سال میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں، اس بنا پر اب اس کا شمار ملک کے مفید اور اہم اداروں میں ہونے لگا ہے، اس کو ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا، ان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے اسی ادارہ کو پدرانہ شفقت کے ساتھ پرورش کر کے پروان چڑھایا، ان کو فارسی زبان سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا، ان کے اس عشق کا اظہار ان کی تصنیف "سخنورانِ ایران در عصر حاضر" سے خاص طور سے ہوگا، جس کی دو جلدوں میں ایران کے موجودہ شعراء پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں، وہ زندگی بھر فارسی کے کسی نہ کسی پہلو پر کام کرتے رہے، کبھی فارسی شاعری پر لکھتے، کبھی کسی فارسی تذکرہ کے ایڈٹ کرنے میں مشغول رہتے، اور جب ایران سوسائٹی قائم کی تو علم، فن اور فارسی زبان سے متعلق ان کے سارے خفتہ جذبات بیدار ہوتے گئے، ایران سوسائٹی کی طرف سے اِنڈو ایرانیکا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، تو اس کے لیے مضامین فراہم کرنے، ان کے ترتیب دینے، چھپوانے اور شائع کرنے ہی میں ان کو زندگی کی تمام لذتیں ملنے لگیں، جب اس رسالہ کی تعریف ان کے کانوں میں پڑ جاتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ انکی زندگی کا اعلیٰ اور واحد مقصد پورا ہو گیا، ان ہی کے بزرگانہ اور پُر اصرار خطوط پر مجھکو بھی اس میں

بہت سے مضامین لکھنے کا موقع ملا، اس سے پہلے میں اسلامک کلچر حیدرآباد کا مستقل مضمون نگار تھا، لیکن اب جب کبھی کوئی انگریزی مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کھڑے نظر آتے ہیں، اور پھر قلم سے انگریزی میں ایسی ہی تحریر نکلتی ہے جو انڈو ایرانیکا ہی کے لائق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو اچانک اللہ کو پیارے ہوگئے، وفات سے پہلے انھوں نے اپنی ساری دولت علم و فن ہی کے فروغ کے لیے وقف کردی تھی، جس میں کلکتہ، علی گڑھ اور پٹنہ یونیورسٹیوں کو بھی حصہ ملا لیکن اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ ایران سوسائٹی ہی کو دیا، اپنا قیمتی کتبخانہ بھی اسی کو عطا کیا، اسکی عمارت کڈ اسٹریٹ میں ہے، یہ سڑک اب ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کے نام سے موسوم کردی گئی ہے، کلکتہ میں کسی علمی ادارہ کے لیے کوئی بڑی عمارت بنوانا آسان کام نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے اس کے لیے ایک بہت بڑی عمارت بھی حاصل کرلی تھی، جو اب لاکھوں روپیے کی ہے،

انکی وفات کے بعد ان ہی کے سرمایہ سے ان کے عقیدتمندوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان ہی کے نام سے سالانہ "میموریل لکچر" کا سلسلہ شروع کیا ہے، گذشتہ سال اس کا پہلا لکچر تھا جس کیلیے فارسی زبان و ادب کے ممتاز محقق ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مدعو کیے گئے تھے،

ان کے لکچر کا عنوان Mohamad Sadiq Isfahani an official of Shah Jahan's time تھا،

معلوم نہیں ایران سوسائٹی والوں کے لیے میری کونسی تصنیف یا تحریر لایق توجہ تھی کہ اس سال اس لکچر کے لیے مجھکو طلب کیا، یہ لکچر انگریزی ہی میں ہوتا ہے، میرے مقالہ کا عنوان یہ تھا Love and adoration for India in Indo-Persian literature with special reference to Bengal. – "ہندوستان کے فارسی لٹریچر میں ہندوستان اور خاص طور سے بنگال سے محبت و تحسین کا اظہار"

اس مقالہ کے لیے میں ۱۱ر ستمبر کی صبح کو ہوڑہ اسٹیشن پہنچا، تو اسٹیشن ہی پر ایران سوسائٹی کے

بعض عہدیداروں سے ملاقات ہوئی، مسٹر آر، ٹی سکلت ایران سوسائٹی کے صدر ہیں، وہ بڑے تپلے نستعلیق سے ہیں، عمر کی کافی منزلیں طے کرچکے ہیں، لیکن ان میں جوانوں کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، مذہباً پارسی ہیں، ایران سوسائٹی سے گہری دلچسپی لینے کے سبب اس کے ارکین ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، مجھ سے بھی بڑے اخلاق سے ملے، عبد المجید صاحب ایران سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، سرکاری ملازم بھی ہیں، لیکن کسی ادارہ سے وابستہ ہوکر اس کو سنوارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، ایران سوسائٹی کے حسن انتظام میں ان کا بڑا حصہ ہے، انگریزی میں فارسی زبان کے بعض پہلوؤں پر مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اپنی زندگی ہی میں ایران سوسائٹی کے لیے اپنے جانشینوں میں سے ان کا بھی انتخاب کرلیا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی کے مختلف عہدوں پر رہ چکے ہیں، آجکل اس کے ٹریزرر ہیں، کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ بھی ہیں، جسم کا وزن بڑھ جانے کی وجہ سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں، لیکن کام انجام دینے میں بڑے چست اور سرگرم ہیں، انکی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، اسی عمر میں کلکتہ کے تمام علمی حلقوں میں مقبول ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کا بس چلتا تو اپنے سینے اور سفینے کا سارا علم ان ہی کو دے جاتے، اور بہت کچھ دے گئے، ان کو اپنی زندگی میں انڈو ایرانیکا کا اڈیٹر بنا گئے، جس کا اونچا معیار وہ ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں، اپنی پیشہ ورانہ مشغولیت کی بدولت انڈو ایرانیکا کو سلیقہ سے اڈٹ کرنے اور اس میں مضامین لکھنے کے علاوہ اسٹیٹسمین، ہندوستان اسٹنڈرڈ، امرت بازار پتریکا، السٹریٹیڈ ویکلی اور دوسرے انگریزی جرائد میں بھی برابر لکھتے رہتے ہیں، قہقہوں میں باتیں کرنے کے عادی ہیں،

ان حضرات کی معیت میں امینیہ ہوٹل ۱۔ کورپرشین اسٹریٹ پہنچا، جہاں ایک بہت آرام دہ کمرہ میں میرے قیام کا انتظام تھا، اسکے مالک حاجی عبد القیوم صاحب ہیں، دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، لیکن اب کلکتہ ہی کے ہوکر رہ گئے ہیں، کلکتہ کے مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی

اور معاشرتی کاموں میں شوق سے حصہ لیتے رہتے ہیں، اپنے اخلاص اور حسن اخلاق کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ایران سوسائٹی سے بھی ان کو گہری دلچسپی ہے۔

شام کو خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی لے گئے، اس کو میں نے ۱۹۶۹ء کے ستمبر میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس تین برس کے اندر اس میں پہلے سے زیادہ رونق دیکھی، خصوصاً اس کے کتب خانہ میں ڈاکٹر محمد اسحٰق کے کتب خانہ کے آجانے سے اس کی زینت میں اضافہ ہوگیا ہے، وہاں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی سے ملاقات ہوئی، جو اس وقت کلکتہ مدرسہ میں حدیث اور تفسیر کے قابل اور مقبول استاد ہیں، ان سے پرانی ملاقات ہے، اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی بے تکلفی سے ملے۔

شام کو ساڑھے چھ بجے مقالہ پڑھنا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب نے وقت سے پہلے وہاں ایک چائے رکھی تھی، وہاں مجھکو لے گئے، بہت سے معززین سے تعارف ہوا، مگر مجھکو جادو یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر جگدیش نراین سرکار سے مل کر خاص طور سے خوشی ہوئی، وہ پٹنہ یونیورسٹی کے بڑے ممتاز اور مشہور طالب علم رہے ہیں، یہ میری بھی مادر درسگاہ رہی ہے، وہ مجھ سے دو سال آگے تھے، انھوں نے میٹرک سے ایم۔ اے تک اول پوزیشن حاصل کی، طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے سنجیدہ، خاموش اور الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے، ہم لوگ دور سے ان کو ایک ہیرو کی حیثیت سے دیکھا کرتے تھے، ان سے تقریباً چالیس برس کے بعد ملاقات ہوئی، اس اثنا میں انھوں نے سرجدو ناتھ سرکار کی نگرانی میں بھی کام کیا، جادو یونیورسٹی کے ایک لائق اور قابل استاد ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، آجکل ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر انگریزی میں کتاب لکھ رہے ہیں، اس موضوع پر میری بھی ایک کتاب نکل چکی ہے، یہ انکی نظر سے گذری ہے، اسکا ذکر دیر تک کرتے رہے، ان ہی کی صدارت میں جلسہ ہونے والا تھا جس سے مجھے اندرونی مسرت ہوئی، انھوں نے بیگ سے اپنا ایک انگریزی مضمون نکال کر دیا، جس کا عنوان یہ ہے؛

Islam in Bengal (13Th To 19Th Centuries) ۔ اس کو میں نے بعد میں پڑھا، تو مجھکو بہت پسند آیا، اب اس کا ترجمہ معارف کی کسی قریبی اشاعت میں شائع ہوگا،

مقالہ خوانی کے جلسہ میں سامعین کی تعداد عموماً بہت کم ہوتی ہے، مگر میری توقع کے خلاف کافی لوگ اس میں شریک ہوئے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے کہا کہ ایران سوسائٹی کے جلسہ میں لوگ شوق سے آتے ہیں، پھر یہ بھی کہہ کر شاید مجھکو خوش کرنے کی کوشش کی کہ آج کا موضوع کچھ ایسا دلچسپ ہے کہ لوگوں کو اس کے سننے کا بڑا اشتیاق ہے، جو حضرات اس میں شریک ہوئے ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہاں کے علمی حلقہ کی ایک جھلک معارف کے ناظرین کے سامنے بھی آجائے گی۔

مسٹر آر۔ ٹی سکلت، صدر ایران سوسائٹی، مسٹر جے۔ ان تعلقدار، آئی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ) نائب صدر سوسائٹی، خواجہ محمد یوسف صاحب ٹرزر سوسائٹی، جناب عبد المجید صاحب جنرل سکریٹری، مسٹر اے کور ساہتی اسسٹنٹ جنرل سکریٹری کے علاوہ معززین شہر میں مسٹر ایس۔ بی رائے، کمشنر سپلائی، حکومت مغربی بنگال، الحاج جناب امیر حسن صاحب، مالک ساسہ موسی شوگر ورکس مل، الحاج عبد القیوم صاحب، مالک امینیہ ہوٹل، جناب احمد سعید صاحب اڈیٹر آزاد ہند، جناب عبد المجید صاحب پروپرائٹر رسل اکسچینج، جناب خلیل الرحمن صاحب مجسٹریٹ سیالدہ پولیس کورٹ، مولانا عبد الفتاح قیم جماعت اسلامی مغربی بنگال و آسام، اور جناب ایس، آر سالک، اور مسٹر ہاشم عبد الحلیم (ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے بھتیجے) تھے، تعلیمی حلقوں سے مسٹر وی، پولاڈ پرنسپل آرمینینس کالج، ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی، پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن صدر شعبۂ فارسی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج، جناب ایس، ایم شاہ القادری، استاد عربی و فارسی، کلکتہ یونیورسٹی، جناب عبد الرؤف صاحب. استاد اردو کلکتہ یونیورسٹی،

جناب محمد اسمٰعیل صاحب استاد عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جناب محمد سمیع اللہ اسد صاحب استاد عربی مولانا آزاد کالج، جناب جاوید نہال صاحب استاد اردو مولانا آزاد کالج، جناب شاہ وصی الدین احمد صاحب اندرا موہن کالج، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاد تفسیر وحدیث کلکتہ مدرسہ، جناب علقمہ شبلی صاحب، استاد کلکتہ مدرسہ اور ڈاکٹر مجیب الرحمن صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج شریک ہوئے،

مقالہ کا لکھنا میرے لیے بہت صبر آزما ثابت ہوا تھا، جب اسکو لکھنے کا ارادہ کیا تو اتنے مواد ملے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی تھی، اس کو سمیٹ کر ایک ایسا مقالہ لکھنا تھا جو ایک گھنٹے کے اندر پڑھ کر ختم ہو جائے، مقالہ پھیلا، سمٹا، سمٹ کر پھیلا اور پھر پھیل کر سمیٹا گیا، میں خود خوش تھا کہ فارسی لٹریچر میں اس ملک سے حب الوطنی اور عقیدت کے کیسے کیسے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، اگر ان کو برابر پیش کیا جاتا رہے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں، فارسی نثر اور شاعری دونوں میں ایسے مواد کی بڑی فراوانی ہے، میں نے تاریخ یمینی، تاج المآثر، برنی اور عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، تزک تیموری، تزک بابری، آئین اکبری، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، بادشاہ نامہ، سیر المتاخرین، ریاض السلاطین وغیرہ سے نثر کے جو ٹکڑے جمع کیے ان کو یہاں پر پیش کرنا ممکن نہیں،

اسی طرح فارسی زبان کے مصنفوں نے ہندوستان کے مختلف علوم وفنون سے جو دلچسپی لی، اسکا ذکر بھی مقالہ میں کیا گیا ہے، باغبانی، مصوری، موسیقی، فن تعمیرات اور دوسرے تمدنی کارناموں کے ذریعہ سے ہندوستان کو جس طرح جنت نشان بنا کر اس کو خلد بریں اور بہشت ہشتمیں بنانے کی کوشش کی گئی، اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی، ان تمام چیزوں کا ذکر یہاں پر طوالت کا باعث ہوگا، البتہ ہندوستان اور اس کے مختلف حصوں پر شعراء نے جو مدحیہ اشعار لکھکر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان میں سے کچھ معارف کے ناظرین کی خدمت میں بھی ہدیہ کرنے کو جی چاہتا ہے،

مولانا منہاج سراج مولف طبقات ناصری شاعر بھی تھے، ان کو فخر تھا کہ سلطان شمس الدین التمش

کے دور میں دہلی میں اسکے ادنی غلام قیصر و کسریٰ اور خان چین سے زیادہ اچھے تھے،

کمیں بندۂ او بہ از قیصر و کسریٰ   کمیں چاکر او بہ از خان چین تتار

عصامی نے فتوح السلاطین میں اسی دور کے دہلی کی تعریف اس طرح کی ہے،

در آں شہر یک رونقے شد پدید   بے لذتے باشد اندر جدید

بسے سیدانِ صحیح النسب   رسیدند در وے ز ملکِ عرب

بسے کاسبانِ خراساں زمیں   بسے نقشبندانِ اقلیم چیں

بسے عالمان بخارا نژاد   بسے زاہد و عابد از ہر بلاد

ز ہر ملک ہر جنس صنعت گراں   ز ہر شہر ہر اصل سیمیں براں

بسے ناقدانِ جواہر شناس   جواہر فروشاں بروں از قیاس

حکیمانِ یوناں طبیبان روم   بسے اہلِ دانش ز ہر مرز و بوم

دراں شہر فرخندہ جمع آمدند   چو پروانہ بر نور شمع آمدند

یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد   دیارش ہمہ دار اسلیم شد

امیر خسرو تو اس کے قائل تھے کہ ملک کی محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا ہے، کہتے ہیں:

دیں ز رسول آمدہ کایں زمرۂ دیں   حب وطن ہست ز ایماں بیقیں

وہ تو اسی محبت میں ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے بہتر سمجھتے رہے، اس کے لیے اپنی مثنوی نہ سپہر میں بہت سے دلائل دیے ہیں، اور پھر اسی مثنوی میں بڑی مسرت اور فراخدلی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان تمام ممالک سے بہتر اور برتر ہے، وہ کہہ اٹھے ہیں کہ

حکمت و دانائی و علم و ہنر   وانچہ کہ در ہند معانیست دگر

وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں ع کشور ہند است بہشتے بزمیں

وہ یہ بھی کہتے ہیں

ہند چو از خلد نشاں بود ورد   زاں ہمہ خدا ایش قدم آسود ورد

وہ ہندی اور سنسکرت کی خوبیوں کے بھی معترف رہے

زبان ہندیم تازی مثال است   کہ آمیزش در انجا کم مجال است

لکھتے ہیں کہ سنسکرت عربی سے تو کمتر لیکن فارسی سے برتر زبان ہے، اس میں فارسی سے کم شیرینی اور مٹھاس نہیں،

آنست زبانے بصفت در دری   از عربی کمتر و برتر از دری

گرچہ کہ شیرینیست دری شکریں   ذوقِ عبارت کم ازاں نیست دریں

وہ تو ہندو مرد اور عورت میں وفاشعاری کا جو جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی متاثر رہے، کہتے ہیں ؎

ہست عجب مردن ہندو بوفا   مردنش از تیغ و ز آتش بجفا

زن ز پے مرد بسوزد بہوس   مرد ز بہر بت و یا منعم و بس

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں   لیک چو بس کار بزرگ ست ببیں

گر بشریعت بود ایں نوع روا   جاں بدہند اہل سعادت بہوا

وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں

اے کہ زنیت طعنہ بہ ہند و بری   ہم ز وے آموز پرستش گری

وہ تو ہندوستان کے نسوانی حسن کے اس طرح قائل رہے کہ اپنی مثنوی دول رانی

میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان کی حسین عورتیں مصر، روم، قندھار، سمرقند، خطا، ختن، خلخ اور تمام حسینانِ عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں، اس کے لیے طرح طرح کے دلائل دیے ہیں، وہ تو زنِ غیر یہاں کے حسینوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، بلکہ انکی شاعری کا آرٹ پان، آم، ہندستانی پھولوں، پھلوں، جانوروں، کپڑوں اور یہاں کی تمام چیزوں کی مدح میں پورے طور پر دکھائی دیتا ہے، دہلی تو ان کا وطن ہی ہوگیا تھا، اس لیے اسکی تعریف میں ان کا قلم کیوں نہ نشاط انگیز ہوجاتا، کہتے ہیں:

حضرت دہلی کنف دین و داد   جنت عدن ست کہ آباد باد

ہست چو ذات ارم اندر صفات   حرسہا اللہ عن الحادثات

گر شنود قصۂ ایں بوستاں   مکہ شود طائف ہندوستاں

شہر بنی را ابرہہ او قسم   شہر خدا گشتہ ز عشقش اصم

قبہ اسلام شدہ در جہاں   بستہ او قبۂ ہفت آسماں

امیر خسرو کے یار غار امیر حسن سجزی کو بھی ہندوستان، دہلی اور اس کے ہر شہر سے اسی طرح محبت رہی، وہ اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کے حکم سے دولت آباد منتقل ہو گئے تو دہلی کو یاد کرکے لکھتے ہیں:

کجاست حضرت دہلی و خوبرویانش   یکے بہشت درون و بروں ادبر حور

لیکن جب دولت آباد ان کا وطن ثانی ہو گیا تو اس کی محبت میں لکھتے ہیں:

زہے خرم بنائے دولت آباد   کہ ہم برپائے دولت باد بنیاد

خداوندا زمیں ایں مکاں را   بدہ قدرے کہ وادی آسماں را

اپنی ایک نظم میں ناگور کا ذکر اس طرح کیا ہے،

سوادش چو خط معشوق دلکش   درو آبے چو اشک عاشقاں وش

وہاں کی عورتوں کے متعلق کہتے ہیں:

زنان سیم سا سیماے سمن ساق
زچوں مہ بل چو خورشید از بتاں طاق

وہاں کے حسن وعشق کی ایک سچی داستان لکھتے ہوئے اس معشوقہ کی قلمی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں :

بت ہند ونسب چوں ترک خوں ریز
بلب شکر بہ غمزہ شورش انگیز

چہ کبکی از کدا مین کوہساری
کہ چوں رفتار خوش گفتار داری

بہشتت باہمہ حوران غلامست
اگر حوری بہشتِ تو کدامست

اس کے سو کر اٹھنے کی تعریف اس طرح کی ہے

بت ہندو سرشت از خواب برخاست
نقاب ابر از مہتاب برخاست

سلطان ناصرالدین محمود کے دربار میں چنگیز خاں کے پوتے نے اپنا ایک ایلچی بھیجا، تو اس کو مرعوب کرنے کے لیے ہر قسم کی شان وشوکت دکھائی گئی، اس موقع پر مولانا منہاج سراج کہہ اٹھے کہ دہلی تو بہشت ہشتمیں اور ہندوستان خوشتر زچین ہوگیا

زترتیب نہاد ورسم وآئین نشاط او
تو گفتی عرصۂ دہلی بہشتِ ہشتمیں گشتہ

مبارکباد بر اسلام ایں بزم شہِ عالم
کزیں ترتیب ہندوستاں بسے خوشتر زچیں گشتہ

تاتاریوں کے مختلف حملوں کا ذکر عصامی نے فتوح السلاطین میں کیا ہے، ہندوستان کی فوج کی برتری اور تاتاریوں کی پسپائی کی مرقع آرائی کرنے میں عصامی نے فردوسی کے قلم کا زور دکھانے کی کوشش کی ہے اسی سلسلہ میں اس کے قلم سے غالباً ہزاروں اشعار نکلے ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے

سپہ راند صفدار ہندوستاں
بگشت از شکوہش سر آسماں

زہندی سواران بل سی ہزار
ہمہ زرد پیل اند از ونیزہ گذار

بدشمن شکارے ہمہ چیرہ دست
خردشان وجوشاں تر از پیل مست

زآہن قبا وکلاہ ہمہ
بکر بستہ گرگاں بقصد رمہ

ستادند پیش سپاہ مغل
ہر سو گرفتند راہ مغل

مغل بیشتر زانکہ راند سپاہ
جہاں دید از گرد گشتہ سیاہ

ایک دوسری جگہ ہندوستانی فوج پر فخر کرتا ہوا لکھتا ہے

ندارد کسے یاد اندر جہاں
چنیں شاہ ولشکر بہ ہندوستاں

گماں می برم اے شہِ نامور
کہ آلِ کیانی بدیں کرّوفر

چنیں آید از خسروان دلیر
کہ باشند در بیشۂ خود چو شیر

اور جب تاتاری پسپا ہوجاتے ہیں تو اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتا ہے

چو بشنید صفدار ہندوستاں
کہ باد خزاں رفت ازیں بوستاں

نرفتند شیران شرزہ شکار
بدنبال سگ خاصہ وقتِ فرار

بمعنی مغل را از ہندوستاں
بروں کردہ چوں بوم از بوستاں

عصامی نے ایک جگہ ہندوستان کی تعریف دل کھول کر کی ہے، جس میں سے چند اشعار یہ ہیں

خوشا رونقِ ملک ہندوستاں
کہ جنت برد رشک ازیں بوستاں

سوادش شدہ زیب روئے زمیں
چو خالے برخسارۂ ہر نازنیں

چو کبریت احمر درو خاک گشت
بہ ہر چار فصلش ہوائے بہشت

سرشتہ ہمہ خاکِ او با گلاب
درو شبنمے دادہ نفعِ سحاب

کشایش ہمہ گلبن ومیوہ دار
زمیں سایہ در سایہ از شاخسار

معطر شدہ خاکش از بوئے گل
معطر شدہ آبش از روئے گل

زخاکش قوی گشتہ اصل بشر
زبادش شدہ خوش ہوائے سحر

بدر چاچ نے نگر کوٹ کے قلعہ پر ایک قصیدہ کہہ کر گویا ہندوؤں کے فن تعمیرات کو خراج تحسین پیش کیا ہے

زہے حصار کہ بیمی ز حلقہ در او ست   محیط نہ زبعض ہفت قلعہ مینا

چہ قلعہ ایست کہ فرشی بود ز رفعت او   فضائے عرصۂ بام و رواق او دانا

فیروز شاہ تغلق کے ساتھ مطہر سندھ کے شہر ٹھٹھ گیا تو اس پر ایک لمبی نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

نے نے کہ شہریست بہشتی ست دلپذیر   آراستہ بسندس و استبرق و حریر

آبش ہمہ گلاب و گلابش ہمہ عبیر   خشتش ز زر سرخ و زمینش ز سیم ناب

فیروز شاہ نے جب فیروز آباد بسایا تو مطہر نے اس پر ایک ترکیب بند کہا جسکے کچھ اشعار یہ ہیں،

حبذا شہر گزیں حضرت فیروز آباد   کہ در و جوی خلود است دیناہا بعداد

ہر طرف طرفہ عمارات ارم ذات عماد   ہر سوئے نزہتِ صحرائے و تماشاہی سواد

آفریں باد بریں شہر و بدیں شاہ جواد   کایں چنیں شہر جہانگیر از و شد بنیاد

ابو الفضل اور فیضی کو تو ہندوستان سے عشق رہا، ابو الفضل کی آئین اکبری تو ہندوستان کا قصیدہ معلقہ ہے، فیضی بھی ابو الفضل ہی کی طرح ہندوستان کی محبت کا دم بھرتا رہا، کہتا ہے

ہند است و ہزار عالم عشق   ہند ست و جہاں جہاں غم عشق

بے نقش و فا خط جبیں نیست   بے رنگ جگر گل زمیں ہست

خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہر ست   ہر ذرہ چراغ نہ سپہر ست

عشق عرب و عجم شنیدم   از ہند بگویم آنچہ دیدم

ایں شعلہ بہ ہند گرم خیز ست   اینجاست کہ آفتاب تیز ست

شاہجہانی دور کا ملک الشعراء ابو طالب کلیم تو ہندوستان کا راگ مختلف طریقے سے الاپتا رہا،

خوشا ہندوستاں ماوائے عشرت   سواد اعظم اقلیم راحت

ز خاک پاک او بر داشتن کام   چناں آساں کہ بردارد کسے کام

کلیم کو ہندوستان سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ ایک بار اس کو اپنے عزیزوں کے ساتھ ایران جانا پڑا تو روتا دھوتا گیا اور ہندوستان کی یاد میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا،

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم   کجا خواہد رساند پرفشانی مرغ بسمل را

بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں   بپائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را

ز شوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم   کہ رو ہم گر براہ آرم نہ بینم مقابل را

مختلف علاقوں اور شہروں پر بھی محبت بھرے اشعار بکثرت ملیں گے کشمیر پر تو اتنی نظمیں کہی گئی ہیں کہ کئی جلدوں میں شائع ہو سکتی ہیں، ابو طالب کلیم نے اکبر آباد پر بڑے اچھے قصیدے کہے ہیں، ملا محمد صوفی مازندرانی (المتوفی ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۵ء) ہندوستان آئے اور گجرات میں سورت میں متوطن ہوئے تو اسکی تعریف میں کہتے ہیں،

بہ گجرات آرند باخود مبر دل   کہ آنجا دل ربا بیش از شمار است

مقرِ من از آں شد شہر سورت   کہ دانستم کہ ایں دار القرار ست

جمال ایں جاندار دباوفا جنگ   صباحت با ملاحت نیز بار است

داراشکوہ کے مرشد ملا شاہ نے اپنی ایک مثنوی نسبت میں ہر جگہ کا ذکر اسکی خصوصیت کے ساتھ کیا، جعفر بیگ بینش کشمیری شاہجہانی عہد کا شاعر تھا، اس نے اپنی مثنوی بینش ابصار میں دہلی، لاہور اور پنجاب وغیرہ کی تعریف کی ہے، بنارس کے متعلق وہ کہتا ہے،

بنارس را عجب آب و ہوائیست   برائے عشق بازی طرفہ جائیست

زن و مرد از محبت گشتہ مفتوں   چو زلف لیلے و زنجیر مجنوں

بتانش از نمک نیکو سرشتند   کہ موجِ سبزۂ باغ بہشتند

دریں کشور کہ از عشق فسوں ساز   بہم کفر و مسلمانیست ہمراز

بنارس پر تو علی حزیں (المتوفی ۱۱۸۰ھ ۱۷۵۹ء) نے بہت سے اشعار کہے، ان ہی کا یہ شعر ہے

از بنارس نروم معبد عام است اینجا   ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

غالب نے تو بنارس پر چراغ دیر کے نام سے پوری ایک مثنوی کہہ ڈالی ہے، جس میں ۱۰۸ اشعار ہیں، اس کا ایک شعر یہ ہے:

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور ...

مگر گوئی بنارس شاہدے است　　ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ان اشعار کو سنکر سامعین محظوظ تو ضرور ہو رہے تھے، مگر کلکتہ میں بیٹھکر بنگال کی مدح سننے کے لیے زیادہ بیچین تھے، مقالہ میں ابوالفضل کی آئین اکبری، غلام حسین طباطبائی کی سیر المتاخرین اور غلام حسین سلیم کی ریاض السلاطین سے بنگال، لکھنوتی، بنگلا، باربک آباد، بزوہا، مداران، ہنڈیا، مرشد آباد کے متعلق دلچسپ اور تعریف آمیز ٹکڑے جمع کیے گئے تھے، اس خطہ سے اس لحاظ سے بھی دلچسپی دکھلائی گئی کہ ایک نامعلوم مورخ نے عبرت ارباب بصر، منشی سلیم اللہ نے تواریخ بنگالہ، یوسف علی خاں نے تاریخ بنگالہ مہابت جنگی، غلام حسین طباطبائی نے سیر المتاخرین، کرم علی نے مظفر نامہ، غلام حسین سلیم نے ریاض السلاطین اور کلیان سنگھ نے واردات قاسمی لکھ کر بنگال کے مختلف ادوار کی تاریخ مرتب کرکے اس کو محفوظ کر دیا، شعراء بھی بنگال کی مدح میں اشعار کہتے رہے، بنگال کی برسات سے غالباً بنگال کے لوگ بھی پریشان رہتے ہیں، لیکن شاہجہانی دور کے ایک شاعر مرزا صادق (المتوفی ۱۰۶۱ھ) کو وہاں کی برسات بہت پسند آگئی، اس نے اس کو موضوع بنا کر جو اشعار کہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

خوشا ملک بنگالہ در برشگال　　سوادش بروے زمیں ہمچو خال

زمیں پر ز آب و ہوا پر ز تیغ　　نہاں آب در سبزہ چوں آب میغ

سیہ ابر پیوستہ در ہائے و ہوئے　　تو گوئی بلا لیست تکبیر گوئے

ز گلہا زمیں گنج پور پشنگ　　نگہبان او اژدہائے چو گنگ

ز کوہ آبشار آنچناں ریختہ　　تو گوئی فلک کہکشاں ریختہ

جہانگیر کے دور میں محمد قاسم خاں بیخبر بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو اسکی تعریف میں

جو شعر کہا، اس سے بڑھ کر مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی جا سکتی ہے،

سواد سبزہ بنگالہ را ہر کس کہ دریابد　　بود او دوزخی گر با بہشتی کار می ماند

منیر لاہوری نے تو بنگال پر پوری مثنوی لکھ دی جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شائع بھی ہو گئی ہے، انیسویں صدی میں ایک شاعر آزاد نے ڈھاکہ پر اور خان بہادر مولوی حمید اللہ نے چاٹگام کی تعریف میں نظمیں کہیں، کلکتہ پر ریاض السلاطین میں ایک لمبی نظم ہے جسکے کچھ اشعار یہ ہیں:

زہے شہر کلکتہ در ملک بنگ　　کہ ہست آں نمودار چین و فرنگ

عمارات آں دلکش و جانفزا　　ہمہ سرکشیدہ باوج ہوا

صنائع دراں کردہ استاد کار　　ہمہ رنگ رنگ و ہمہ خوش نگار

بہر کوچہ اش مہ رخاں در طواف　　ببر کردہ پوشاک رنگین و صاف

رخ شان چو ماہ منور بتاب　　تو گوئی زمیں سیر شد ماہتاب

یکے چوں مہ و آں دیگر مشتری　　یکے ہمچو زہرہ بجلوہ گری

زبس شمع چو سیارہ ہر سو چماں　　شدہ کوچہ ہا نقشہ کہکشاں

بہ بینی کنی گر بہ بازار رو　　متاع نفیس جہانی در و

بود ہر چہ در ربع مسکوں قماش　　بیابی بہ بازار او بے تلاش

گر از اہل صنعت نماہم رقم　　چناں نقش صورت نبندد قلم

ولی ہست مشہور در خاص عام　　کہ صنعت بہ چین و فرنگ است تمام

بہ گلگشت مردم چوں آں نور رند　　چو سیارہ در سیر باہم شوند

چنیں شہر در ملک بنگالیاں　　ندیدست کس نے شنیدہ چناں

غالب کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات بھی دیے گئے جن میں کلکتہ کی تعریف ہے،

اور پھر ان کے اشعار بھی پیش کیے گئے ۔

حالِ کلکتہ باز جستم — باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم ہم رسد درشے — گفت از ہر دیار و از ہر فن

اسی سلسلہ میں غالب کے وہ مشہور اردو اشعار سنائے گئے، جس کا پہلا شعر یہ ہے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

آخر میں ایران کے سابق سفیر ہند حکمت علی اصغر کے یہ اشعار بھی سنائے گئے

جو تیر نگاہت بہ جگر مستہ ندیدم — چو ناوکِ مژگان تو البتہ ندیدم
دیدم بہ جہاں شہر بسے خرم و آباد — شہرے بدلآرائی کلکتہ ندیدم

کلکتہ میں بیٹھ کر بنگال اور کلکتہ کی تعریف سنکر وہاں کے لوگوں کا محظوظ ہونا اگزیر تھا، جلسہ میں بظاہر شعر و شاعری کے بزم کی فضا قائم ہوگئی تھی، ۳۵ صفحے کا مقالہ بعض حصے کو حذف کرنے کے باوجود، ۵۰ منٹ میں ختم ہوا، اور صرف خلاصہ درج کیا گیا ہے، جب یہ مقالہ ختم ہوا، تو حاضرین نے بہت سے سوالات کیے، جن سے اندازہ ہوا کہ یہ طویل مقالہ ان کے لیے صبر آزما ثابت نہ ہوا بلکہ انھوں نے دلچسپی سے سنا۔ پروفیسر جگدیش سرکار اپنی اختتامی تقریر کے لیے ایک پُر مغز تحریر لکھ کر لائے تھے، مگر انھوں نے اس کو پڑھنا پسند نہیں کیا اور اپنی انتہائی شرافت و اخلاق میں کہا کہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد: وہ آج رات کے مقالہ نگار کے سامنے محض ایک ڈوارف (بونا) نظر آئیں گے، یہ کہکر انھوں نے محض اپنی خاکساری کا ثبوت دیا۔ ورنہ ان کے قلم سے جو بھی تحریر نکلتی ہے اس سے ان کی علم کی گہرائی اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنی تحریر پڑھتے تو ہم سب مستفید ہوتے،

آخر میں ایران سوسائٹی کی طرف سے صدر جلسہ کے ہاتھوں Iran Society کی ایک جلد مجھکو دے کر میری عزت بڑھائی گئی، Silver Jubilee Souvenir (1944-1969)

یہ ایران سوسائٹی کا تازہ علمی کارنامہ ہے۔ ۴۰۰ صفحے پر مشتمل ہے، بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ تیار کی گئی ہے، اس میں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے تقریباً تیس مشہور اہل قلم کے بڑے بلند پایہ اور گرانقدر مقالات ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم ایران سوسائٹی کی پچیس سالہ جوبلی کی خوشی میں اس کو مرتب کر رہے تھے، اس کا کچھ حصہ انکی نگرانی میں چھپ بھی چکا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات ہوگئی، تو پھر یہ کام ایک اڈیٹوریل بورڈ کے ذریعہ طے پایا، جس میں ڈاکٹر اے۔ کے۔ بی۔ ق، مسٹر وی۔ پولیسٹین جناب خواجہ محمد یوسف اور جناب ام۔ اے۔ مجید صاحبان تھے، یہ جلد ایران سوسائٹی کے بہت ہی اہم کاموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، معارف میں آیندہ اس پر تفصیلی ریویو شائع ہوگا، جلسہ کی کارروائی جیسے ہی ختم ہوئی تو جناب الحاج امیر حسن صاحب میری طرف بڑھے، ان کی داڑھی سر سید احمد خاں کی یاد تازہ کرتی تھی، ان کا چہرہ بڑا منور اور متدین نظر آیا، انگریزی سوٹ پہنے ہوئے، جس کے اندر سے ان کی مذہبیت اور بھی زیادہ نکھری اور ستھری معلوم ہو رہی تھی، جلسہ کے اور معزز حاضرین سے بے تکلفانہ انداز سے ملنے ملانے کے بعد یہ دلچسپ صحبت ختم ہوئی۔

اسی کے بعد خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی طرف سے امینیہ ہوٹل میں ایک ڈنر رکھا تھا جس میں جلسہ کے بہت سے شرکاء کے علاوہ کلکتہ ہائی کورٹ کے آنریبل جسٹس ایس۔ اے۔ مسعود اور وہاں کے مشہور رہنما خان بہادر جان محمد صاحب بھی شریک ہوئے، مسٹر جسٹس مسعود اب حکومت ہند کے فنانس کمیٹی کے رکن ہو گئے ہیں، بہت ہی اخلاق سے ملے، ان کی مادری زبان بنگالی ہے، لیکن گفتگو اردو ہی میں کی، خان بہادر جان محمد صاحب کے اسم گرامی سے اچھی طرح واقف تھا، اخباروں میں ان کا ذکر برابر آتا ہے، میری ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی، وہ شروانی، داڑھی اور منور چہرہ کے ساتھ بہت بھلے اور اور باوقار نظر آئے، ان کے علاوہ کلکتہ کے دو ممتاز اڈوکیٹ جناب شہادت حسین اور جناب سید

ابو المنصور حبیب اللہ بھی تھے، ڈنر ختم ہوا تو میری توقع کے خلاف جناب خلیل الرحمٰن صاحب مجسٹریٹ ایک نظم پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جس میں کچھ میرا ذکر کرکے یہ بھی پڑھا ؎

بزم ایراں میں ہو ہمیشہ بہار لگے اس کو نہ کبھی بادِ سموم

اس کے بعد جناب علقمہ شبلی صاحب نے ایک نظم بہار سلیمانی کے عنوان سے پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

گلشن شبلی نعمانی سے آئی بن کے نسیم وہ بشش پر اپنے لیے ملک سلیماں کی بہار

اس کے بعد جناب احمد سعید اڈیٹر آزاد ہند نے ایک تقریر کی جس میں دار المصنفین کے کارناموں کو سراہا، اس کے جواب میں مجھ سے بھی جو کچھ بن پڑا، تھوڑی دیر تک بولتا رہا، یہ صحبت بھی دلچسپ رہی، اور تقریباً بارہ بجے رات کو ختم ہوئی، صبح کے وقت میں سو کر جیسے ہی اٹھا تو جناب احمد سعید صاحب میرے کمرے میں آئے، ان کے ہاتھ میں آزاد ہند تھا، جس میں رات کے جلسہ اور کھانے کی روداد بھی موجود تھی، اس عاجلانہ رپورٹنگ سے آزاد ہند کی کارکردگی کا اچھا اثر پڑا، ابھی احمد سعید صاحب باتیں ہی کر رہے تھے کہ جناب شاہ مقبول احمد صاحب، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج ملنے آگئے جو محض ان کی محبت کا ثبوت تھا، وہ بہار ہی کے ہیں، اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ دار المصنفین سے بہار کی تاریخ شائع ہونی چاہیے، میں نے ان سے کہا کہ بہار کے اہل قلم بہار میں رہ کر تاریخ مرتب کر دیں تو دار المصنفین اس کو ضرور شائع کر دے گا، انھوں نے مجھ سے لکھنے کو کہا، مگر میں نے ان سے ہنس کر کہا۔ اب تو میں چالیس برس کے بعد خالصۃً یو، پی کا ہو چکا ہوں، اس کے بعد جناب عبد المجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور پروفیسر عطا کریم برق آگئے۔ میں برق صاحب کے ساتھ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب سے ملنے چلا گیا، انھوں نے ۶۔ سہروردی ایونیو میں ایک بڑا مکان بنا لیا ہے، اس میں ہر طرح کی خوش سلیقگی، صفائی اور ستھرائی دکھائی دیتی ہے، ان سے

پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی وہ میرے استاد بھی رہ چکے ہیں، انکی نگرانی میں پی، ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھنا شروع کیا تھا، جو ہندوستان کے صوفیائے کرام کے حالات اور علمی کارنامے پر مشتمل تھا، جب یہ ختم ہوا تو ان بزرگان دین کو دنیاوی کاموں میں استعمال کرنا اچھا نہ سمجھا، اسلیے یہ بزم صوفیہ کے نام سے دار المصنفین سے شائع ہو گئی ہے، مگر اسکے محرک ڈاکٹر صاحب ہی تھے، جس کیلیے ان کا ابتک شکر گذار ہوں، وہ حسب معمول بڑی شفقت سے ملے، اس مرتبہ انکو بہت ضعیف پایا، پھر بھی کچھ نہ کچھ علمی کام کرتے رہتے ہیں، اپنے ایک تازہ مقالے کی مطبوعہ کاپی دکھائی، جو دہلی کے رسالہ اسٹڈیز ان اسلام میں اطراف الحدیث کے عنوان سے شائع ہوا ہے، شام کو جناب احمد سعید صاحب کے یہاں ایک دلچسپ صحبت رہی، وہ اپنے فلیٹ پر بہت ہی سلیقہ سے رہتے ہیں، تقسیم ہند سے پہلے وہ کچھ دنوں دار المصنفین میں قیام کر چکے تھے، میں انکے والد مرحوم مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی سے دہلی میں برابر ملتا رہا، بلکہ ایک بار انکے یہاں نرولا ہوٹل میں کافی دنوں تک مقیم بھی رہا، اسی لیے ہم دونوں عزیزانہ طور پر ملے، اس نشست میں زیادہ تر انکے والد مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد کے گہرے تعلقات کا ذکر رہا، کچھ رات گذرے اپنے کمرہ میں پہنچا تو مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی اور حسن زماں صاحب وہاں موجود تھے، مولانا معصومی بارہ بجے رات تک دینی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے جس سے متاثر ہوا، حسن زماں صاحب کلکتہ کے ایک مخلص اور علم دوست نوجوان ہیں، انکے گھر میں بنگالی اور اردو دونوں بولی جاتی ہے، مگر انکو ہندوستان کے تمام اہل علم اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی تمام خانقاہوں سے گہری دلچسپی ہے، دوسری صبح کو روانگی تھی، جناب عبد المجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور جناب احمد سعید صاحب ساتھ اسٹیشن چلے، اسی صبح کو احمد سعید صاحب نے اپنا سفرنامہ حج "اللہ کے گھر میں" پڑھنے کو دیا، اور جب گاڑی چلنے کو تھی تو ایک صاحب حسن زماں صاحب کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے، انکے ہاتھ میں بزم صوفیہ تھی، تصنیف کے ساتھ شاید اسکے مصنف کو دیکھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی جلدی سے میرے ہاتھ میں دیا، اسکا نام "مان تھا" اسی میں انکا نام حسین وارثی سہسرامی صاحب پڑھا، گاڑی چلی تو "اللہ کے گھر میں" پڑھنا شروع کیا، جو اس قدر دلچسپ اور پُر تاثیر تھی کہ دن بھر کا سفر اسی کو لطف و لذت سے پڑھنے میں گذر گیا، مرتب کی گہری مذہبیت سے متاثر ہو کر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں،

مطبوعات جدیدہ

نقد ابو الکلام مرتبہ ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب صدر شعبہ اردو، عربی، فارسی، سری دنکٹیشور ایونیورسٹی، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت غنیمت صفحات ۵۱۱ مجلد قیمت درج نہیں، شائع کردہ رجسٹرار سری دنکٹیشور ایونیورسٹی، تروپتی (آندھرا)

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم پر ابتک جو کتابیں لکھی گئی ہیں زیر نظر کتاب ان سب میں زیادہ ضخیم ہے، اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم "یہ تصنیف کہنے کو "نقد ابو الکلام" ہے، لیکن حقیقتاً اردو کے انانیتی ادب کا تفصیلی اور تقابلی مطالعہ ہے"، یہ چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں انانیت کی حقیقت و ماہیت اور اس کے خط و خال اجاگر کئے گئے ہیں، اور آخری باب میں مولانا کے افکار و تصورات کا جائزہ لیکر انانیتی ادب کے بارہ میں ان کی جدت و انفرادیت اور امتیازی کمالات و خصوصیات دکھائے گئے ہیں، درمیان کے چار ابواب میں بالترتیب میر، غالب، سرسید احمد خاں اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے انانیتی رجحانات و میلانات کا ذکر کرکے ان سے مولانا کی انانیت کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا اردو کے انانیتی ادب کی تاریخ اور اس کا مفصل تجزیہ ہے، اور اس میں تنہا مولانا ہی کے کارنامے اور انانیتی رجحانات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اردو کے مذکورہ بالا چار دل مشاہیر کے علاوہ دوسرا ساطین شعر و ادب کے انانیتی میلان و نقطہ نظر پر بھی سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، ابھی تک

اردو کے انانیتی ادب کے بارہ میں اس قدر مفصل اور پُر از معلومات کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، لائق مصنف نے اردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں اور مبصروں کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس لئے یہ بڑی قابل قدر اور ضخیم ہونے کے باوجود دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے، لیکن غالب و ابو الکلام کے تقابلی مطالعہ کے ضمن میں مولانا کی انانیت کی برتری دکھاتے وقت دونوں کے عہد کے فرق کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جبکہ سرسید اور مولانا کے موازنہ میں مولانا کے ترجیحی پلڑے کو عہد کے فرق کا نتیجہ بتایا گیا ہے، سرسید اور مولانا کے مماثل کے باب میں "تفریق ملت اور تقسیم انسانیت" کے زیر عنوان سرسید مرحوم کی جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، ان میں مسلمانوں کے فقہی و فرد عی اختلافات کا ماتم ہے، حالانکہ مولانا نے بھی مختلف مذاہب کے تفرقے کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح سرسید نے "وحدت دین" کے پہلو کو صرف نمایاں کیا ہے، لیکن مولانا "وحدت ادیان" کے داعی معلوم ہوتے ہیں، ظاہر ہے ان دونوں کی نوعیت میں بڑا فرق ہے، مولانا کی طرح سرسید کو بھی "متحدہ قومیت" کا حامی ثابت کرنا زبردستی کی بات ہے، اور ان کی تفسیر کو مولانا کی تفسیر کا اصل ماخذ ثابت کرنا بھی زبردستی ہے، دونوں کی آزادی فکر اور عقلیت کے سلسلہ میں مصنف کے قلم سے بعض اور غیر معتدل باتیں بھی نکل گئی ہیں، ص ۴۵۲ پر شاہ ولی اللہ دہلوی کے ترجمۂ قرآن کی وجہ سے ان کے نیچے اتارنے کی بے سرو پا روایت بھی درج ہے، مولانا کی اصول پسندی اور شان بے نیازی کو ان کی عظمت کے بجائے سطحیت پر محمول کرنا تعجب انگیز ہے، اس قسم کی اور بھی بعض باتیں کھٹکتی ہیں، لیکن ان سے کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی محنت و کاوش میں فرق نہیں آتا، انھوں نے اس کو بڑے اعتماد و جرأت کے ساتھ لکھا ہے، اور اس سے ان کی ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے،

مجلہ علوم الدین مرتبہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ،

صفحات ۹۰، قیمت درج نہیں، پتہ فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح فیکلٹی آف تھیالوجی نے بھی اب پہلی دفعہ اپنا مجلہ شائع کیا ہے، اس کی ترتیب وادارت کی ذمہ داری فیکلٹی سے وابستہ ایک باذوق صاحب علم وقلم مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے حصہ میں آئی، جو حق بحقدار رسید کے مصداق ہے، اُن کا نام ہی مجلہ کی خوبی کی ضمانت ہے، یہ مجلہ نو بلند پایہ دینی علمی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین انھی لوگوں کے قلم کے ہیں، جو فیکلٹی سے متعلق ہیں، یا پہلے متعلق رہے ہیں، یوں تو سب ہی مضامین فیکلٹی کے معیار و مرتبہ کے شایان شان عالمانہ اور محققانہ ہیں، لیکن فاضل مرتب کا مضمون "مولانا عبدالحی فرنگی محلی، اور اُن کی تاریخی خدمات" خاص طور پر قابل ذکر اور پُر مغز ہے، انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ فن رجال و تاریخ میں مولانا کی خدمات کا اس قدر مفصل جائزہ لیا ہے، ناسخ و منسوخ (ڈاکٹر قاری رضوان اللہ) چوتھی صدی ہجری کی ایک عظیم عہد ساز علمی و دینی شخصیت (ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن کاموری) بھی مفید مضامین ہیں "کچھ یادیں" (پروفیسر حمید اللہ خاں) نہایت دلچسپ اور شگفتہ و برجستہ مضمون ہے، لائق مرتب نے افتتاحیہ میں فیکلٹی کی گذشتہ خدمات اور موجودہ کارگذاری کی مفصل روداد بھی سنائی ہے جو دلچسپ بھی ہے، اور اس سے فیکلٹی کے متعلق مفید اور ضروری معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، شروع میں ملا نظام الدین محمد سہالوی بانی درس نظامی کے دو اصل خطوط کے عکس درج ہیں، گو فیکلٹی کا یہ پہلا نمبر ہے، مگر مضامین کے تنوع، معیار، ترتیب کے سلیقہ اور طباعت کی نفاست وغیرہ کے اعتبار سے بہت خوب ہے، اس کی اشاعت پر لائق مرتب اور فیکلٹی دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔

"ض"

جلد ۱۱۰ ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲-۴۰۴

مقالات

خریطۂ جواہر	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۵-۴۲۸
مولانا محمد علیؒ کی یادیں	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۴۲۹-۴۴۰
مرکزی سیاست اور قانون شخصی	جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس	۴۴۹-۴۵۳
اسلام اور عرب سوشلزم	مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین	۴۵۴-۴۶۱
مولانا شاہ غلام مرتضیٰ جنونؔ اور ان کی تفسیر مرتضوی، منظوم اردو	جناب مولانا قاضی سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی	۴۶۲-۴۷۲

ادبیات

غزل	جناب عروج زیدی	۴۷۳
"	جناب رفیع الدین احمد صاحب سالک حمانی	۴۷۴
"	جناب اسلم سندیلوی	"
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۷۵-۴۸۰